اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا رسالہ

اشاعت نومبر ۱۹۹۴

مجلس ادارات

******

جناب مصلح الدین سعدی

جناب ذکریا شریف

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

جناب وجیہ الدین احمد

محمد ظہیر الدین احمد

(معتمد مجلس ادارت)

مجلس مشاورت

****

پروفیسر سعید اختر درانی

شعبہ طبعیات برمنگھم یونیورسٹی

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی

شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

جناب محمد طارق غازی

میجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ، جدہ

ڈاکٹر معین الدین عقیل

شعبہ اردو، جامعہ کراچی

پروفیسر سید سراج الدین

صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد

بدل اشتراک

ہندوستان

فی شمارہ -/۳۰ روپے   دو شماروں کے لئے -/۵۰ روپئے

بیرونی ممالک

فی شمارہ - ۳ ڈالر یا اس کے مساوی رقم

ISBN - 81 - 86 3[illegible]0 -01 -3

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

"اقبال ریویو" دفتر اقبال اکیڈیمی، مدینہ منشن

نارائن گوڑہ حیدرآباد آندھراپردیش (انڈیا)

پن کوڈ: 500029

فون نمبر: 595230

ایڈیٹر پرنٹر پبلیشر وجیہہ الدین احمد معتمد اقبال اکیڈیمی نے اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد میں چھپواکر دفتر اقبال اکیڈیمی نارائن گوڑہ، حیدرآباد (آندھراپردیش) سے شائع کیا۔

فہرست

۱- اداریہ	وجیہ الدین احمد	۱
۲- اسلام اکیسویں صدی میں	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۳
۳- جمہوریت اقبال کی نظر میں	ڈاکٹر تحسین فراقی	۱۹
۴- ابلیس کی مجلس شوریٰ ایک مطالعہ	مصحف اقبال توصیفی	۳۶
۵- اقبال کی شاعری کے ادبی اور فکری سرچشمے	ڈاکٹر یوسف اعظمی	۴۶
* انتخاب اقبالیات		
۶- اقبال	ابراہیم جلیس	۵۳
۷- اقبال کی ہمہ گیری	جہاں بانو	۶۴
۸- اقبال میری نظریں	بال ریڈی	۷۵
۹- علامہ اقبال (دیدہ و شنیدہ)	دوارکاداس شعلہ	۸۰

اداریہ

اقبال کے فکر وفن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ لکھنے والوں نے ان کے فکر پر توجہ دی اور فن پر بھی۔ فن پر جو مضامین لکھے گئے ان میں وقیع مضامین بھی ہیں اور کچھ ایسے بھی جن پر سرسری ہم جہان سے گزرنے والی بات صادق آتی ہے۔ کچھ یہی صورت مستقل کتابوں میں بھی ملتی ہے۔ یہی حال اس ادب کا بھی ہے جن میں ان کے فکر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو اور فارسی ادب کا کلاسیکی سرمایہ کے پس منظر میں اقبال کی ادبی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوے جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں ان کی شاعری اور فن پر لکھے گئے مضامین مقالات اور کتب کی تدوین کی جائے۔ اقبال نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کیفیت اور کمیت ہر اعتبار سے عظیم شعری ورثہ چھوڑا ہے۔ ان کے فکر پر بھی اب تک کو کچھ لکھا گیا اس کا بھی ان کے بنیادی تصورات کی روشنی میں غائر نظر سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ کتب ورسائل مقالات و مضامین کے انبار میں فکر اقبال کی مختلف تاویلات اور تشریحات

شد بہر بیشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

کا مصداق نظر آتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اقبالیات کو ایک باقاعدہ شعبہ کی حیثیت دی جائے اقبال اپنی حیات ہی میں ہندوستان سے نکل کر دنیا کے دیگر ممالک میں پہنچ چکے تھے اور اس کے بعد ہی سے ساری دنیا میں علم کے مختلف شعبہ جات میں فکر اقبال کا مطالعہ کیا جارہا ہے اس لئے اور بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ اقبالیاتی ادب کی ترتیب و تدوین ایک سائنٹفک مضمون کی طرح کی جائے

اقبال کے خطبات پر بھی گو بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن عصر جدید میں خطبات میں

پیش کردہ نقاط نظر کے بہ نظر غائر مطالعہ کی ضرروت ہے۔اس موضوع کی اہمیت کی پیش نظر ضرورت ہے کہ اس پر بھرپور توجہ دی جائے۔ادارہ اقبال ریویو اپنے قلمی معاونین سے اس بات کی گزارش کرتا ہے کہ خطبات اقبال ہر مقالے سپرد قلم فرمائیں۔اسی طرح جاوید نامہ کا خصوصی مطالعہ بھی توجہ کا طلب گار ہے۔

اقبال ریویو کا مقصد فکر اقبال کا فروغ رہا ہے۔ان کے افکار و خیالات کی ہمہ گیری کے پیش نظر اقبال ریویو میں ان مضامین بھی شائع کیا جاتا ہے جو فکر اقبال سے بالواسطہ متعلق ہیں یا جن موضوعات سے اقبال کو خصوصی دلچسپی تھی۔اس شمارہ میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کا مقالہ شائع کیا گیا ہے جو عصری مسائل کے تناظر میں آنے والی صدی میں اسلام کے موقف پر ڈاکٹر یوسف اعظمی کے مقالوں کے ساتھ کچھ قدیم رسالوں سے منتخب مضامین پر مشتمل ہے جن میں جہاں بانو، دوارکاداس شعلہ، بال ریڈی اور ابراہیم جلیس کے مضامین شامل ہیں۔یہ مضامین "آج کل" "ہندوستانی ادب" اور "عضراب" میں شائع ہوے تھے جواب کمیاب ہوگئے ہیں۔

وجیہ الدین احمد

پروفیسر نثار احمد فاروقی

اسلام: ۲۱ویں صدی میں

اکیسویں صدی دروازے پر دستک دے رہی ہے اور اہل سیاست نے ہمیں بہلانے کو ایک اور کھلونا دے دیا ہے جیسے ایک مفلس ماں اپنے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کو تسلی دینے کے لیے خالی ہانڈی چولھے پر چڑھا کر کہہ دے کہ بس اب کھانا پک جائے گا تو تمھیں کھلائیں گے۔

پہلے یہ سوچیے کہ اکیسویں صدی ہے کیا؟ اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہیکہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی ولادت کو دو ہزار سال پورے ہو جائیں گے۔ یہ مغربی تہذیب سے ہماری مغلوبیت کی علامت ہیکہ ہم تاریخ، تہذیب، سیاست، معاشرت، ہر شعبۂ زندگی کو، ان کے آغاز و انجام کو مغرب کے حوالے کر چکے ہیں۔ تاریخ کو محض یاد رکھنے کے لیے کسی بڑے حادثے یا واقعے سے جوڑ دیا جاتا ہے جیسے کعبہ پر ابرہہ کے حملے کا سال عام الفیل کہلاتا ہے، اسلام سے پہلے عام الفیل کو ایک نقطہ آغاز سمجھ کر تاریخ کا حساب کیا جاتا تھا، مثلاً یوں کہتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت عام الفیل کے آغاز سے ۴۴ دن بعد ہوئی تھی۔ یا ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی مکہ سے مدینے کو ہجرت ایک تاریخ ساز واقعہ تھا اسے نقطۂ آغاز مان ہجری تقویم بنالی گئی۔ بعض مقامی حوادث بھی مرکزی نقطہ بن جاتے ہیں جیسے ایک حیدرآبادی بزرگ نے کہا کہ رود موسیٰ میں طغیانی آئی تو میں آٹھ برس کا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور بھی ایک نہایت اہم اور دوررس نتائج پیدا کرنے والا واقعہ ہے مگر ساری دنیا کی، ہر ملک اور ہر قوم کی سیاست اور معاشرت یا اس کی خوش حالی اور بدحالی اس واقعے سے جڑی ہوئی نہیں ہے یہ صرف وقت کو ناپنے کا ایک پیمانہ ہے۔ دنیا کے حوادث یا قدرت کا کارخانہ کیلنڈر دیکھ کر نہیں چلتا۔

اب یہ دیکھیے کہ وقت یا زمان یا دہر کیا ہے؟ یہ ازل سے ابد تک ایک اکائی ہے انسان نے اپنی سہولت کے لیے اسے خانوں میں بانٹ لیا ہے اس نے دیکھا کہ دن اور رات کا تعلق سورج کے نکلنے اور غروب ہونے سے ہے تو رات اور دن کا تعین کر لیا اور اسے ۲۴ گھنٹوں میں بانٹ لیا، پھر گھنٹوں کے منٹ اور منٹوں کے سکنڈ بنالیے ورنہ اسی زمین پر وہ علاقے بھی ہیں جہاں چھ مہینے دن رہتا ہے چھ مہینے رات رہتی ہے۔ زمین پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کی تصویریں فضا میں محفوظ رہتی ہیں اگر کبھی انسان اتنی نازک اور حساس مشینیں ایجاد کر سکا کہ ان تصویروں کو

اپنی گرفت میں لے آئے تو ہم سو پچاس کیا لاکھ دو لاکھ سال پہلے کی انسانی حرکتوں کو بھی اسکرین پر اسی طرح دیکھ سکیں گے جیسے آج ٹی وی دیکھتے ہیں۔ شریعت کی زبان میں اسی بات کو یوں کہا گیا کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعضاء انکے اعمال کی گواہی دیں گے۔

زمانے کو ہم نے ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کر رکھا ہے مگر قدیم فلاسفہ بھی یہ کہتے ہیں کہ حال کوئی زمانہ نہیں ہے۔ ہر لمحہ مستقبل سے آرہا ہے اور ماضی کے ظلمات میں گم ہو رہا ہے ہم نہ ماضی کو زندہ کر سکتے ہیں نہ مستقبل پر قابو پا سکتے ہیں یعنی جو کچھ ہو گیا اسے کالعدم نہیں کر سکتے اور جو ہونے والا ہے اسے وقت مقرر سے پہلے وجود میں نہیں لا سکتے۔ وعندہ مفاتیح الغیب لا یعلمھا الاھو ○ کا مفہوم یہ بھی ہے، ہمارے لیے ماضی اور مستقبل دونوں ہی غیب ہیں۔

غالب نے کہا تھا؛

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں ؟

جب، ہم دو غیبوں کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں تو سوچیے کہ شہود کہاں ہے ؟ اس کی حقیقت کیا ہے ؟

یہ تو فلسفیانہ بات ہوئی اب یہ دیکھیے کہ اسلام میں وقت کا تصور کیا ہے ؟

قرآن کریم میں ایک سورۃ کا نام ہی الدھر ہے، دہر زمان و مکان دونوں کو جامع ہے

اللہ تعالیٰ کہتا ہے ؛

نحن خلقناھم وشددنا اسرھم واذا شئنا امثالھم تبدیلا (الدھر ۲۸)

ان کو ہم نے ہی پیدا کیا ہے اور ان کے بندھن مضبوط باندھ دیے ہیں، اور جب ہم چاہیں ان کی جگہ پر ان جیسے دوسرے لے آئیں گے۔

اسی کو فلاسفہ تجدد امثال کا نظریہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسری بحث ہے

۔ پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے ؛

وتلک الایام نداولھا بین الناس (آل عمران ۱۴۰)

اور یہ ایام زمانہ ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔

پھر ایک اور موقع پر قدرے وضاحت سے کہا ؛

الم یروا کم اھلکنا من قبلھم من قرن مکنا ھم فی الارض مالم نمکن لکم وارسلنا السماء علیھم مدرارا وجعلنا الانھار تجری من تحتھم فاھلکناھم بذنوبھم وانشانا من بعدھم قرنا آخرین ○ (سورۃ الانعام ۶)

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک کر دیا جنھیں زمین پر اقتدار دیا تھا، ایسا اقتدار جو تمھیں بھی نہیں دیا۔ ہم نے آسمان سے ان پر خوب بارشیں برسائیں

کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہو گئیں۔ پھر ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں ہلاک کر دیا اور انکی جگہ پر دوسری قوموں کو لاکر بٹھادیا۔

یہ اور ایسی دوسری متعدد آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گردش ایام خود موثر نہیں ہے موثر حقیقی ہے۔ بقول شاعر:

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردہ ، زنگاری میں

ترمذی کی ایک حدیث میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایسب احدکم الدھر فان اللہ ھو الدھر

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی زمانے کو برا نہ کہے کیوں کہ حقیقت میں اللہ ہی زمانہ ہے۔

اس مختصر گفتگو کے بعد موضوع گفتگو پر آتا ہوں: "اسلام ۲۱ ویں صدی میں" یہاں یہ غور کرنا ہوگا کہ اسلام کیا ہے؟ وہ کوئی جامد شے ہے یا متحرک اور تغیر پسند نظریہ ہے۔ آج کل اغیار نے اسلام پر چاروں طرف سے یورش کر رکھی ہے۔ یہ ایک انتقامی ذہن کام کر رہا ہے جو ذرائع ابلاغ پر قبضہ کر کے عام لوگوں کو یہ سبق پڑھا رہا ہے کہ اسلام فرسودہ مذہب ہے۔ اس کے احکام ظالمانہ ہیں، یہ کٹھ ملاؤں کا دین ہے وغیرہ۔ اس انتقامی کاروائی کا نام رکھا ہے بنیاد پرستی۔ یہ نئی اصطلاحیں گھڑنے ان سے کھلواڑ کرنے اور ان میں الجھا کر عوام کو گمراہ کرنے یا جاہل بنانے کا بڑا نظر فریب طلسم ہے۔ ہر مذہب کیا، ہر علم اور ہر فن کی ایک بنیاد ہوتی ہے اس کی پابندی اور پیروی کر کے ہی وہ علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں فن موسیقی کے بڑے تیس مار خاں قسم کے استاد پڑے ہوئے ہیں ان کو چیلینج کرتا ہوں کہ وہ موسیقی کی بنیاد یعنی سارے گاما پادھانی سے کترا کر دو منٹ گا کر دکھا دیں۔ اگر نہیں گا سکتے تو اسلام پر ہی بنیاد پرستی کا لیبل کیوں لگایا جا رہا ہے۔ موسیقی کی مثال تو محض شرافت کو ملحوظ رکھ کر دی جاتی ہے ورنہ ان الزام لگانے والوں کی مذہبی بنیاد پرستی پر بھی عمل جراحی خوب ہو سکتا ہے۔ مگر کیا کریں:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

خیر، میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلام کا جوہر ہے قرآن اور اس کے اعراض ہیں حدیث، فقہ، تفسیر سیرۃ وغیرہ۔ بنیاد بہر حال قرآن ہے وہ جس دن پہلی آیت نازل ہوئی تھی کہ

اقرا باسم ربکالذی خلق خلق الانسان من علق۔

پڑھئے۔ اپنے رب کا نام لے کر۔ جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو ایک لوتھڑے سے بنادیا ہے۔

اس دن سے آج تک وہی قرآن ہے، اس کی حفاظت خود اللہ کر رہا ہے اور اس نے کہہ دیا ہے کہ نہ اس میں آگے پیچھے کہیں باطل گھس پیٹھ کر سکتا ہے نہ کوئی اس جیسا دوسرا لکھ سکتا ہے۔ اسلام کا کلمہ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ ہے۔ دنیا کا سب سے پہلا مسلمان بھی یہی الفاظ ادا کر کے حلقہ اسلام میں شامل ہوا تھا اور دنیا کا آخری مسلمان بھی یہی شہادت دے کر مسلمان ہو سکے گا۔

اس اعتبار سے ہمیں ذرہ بھر شرم کئے بغیر ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہنا چاہیئے کہ اسلام سخت جامد و منجمد غیر تغیر پذیر اور اٹل مذہب ہے اس میں کسی کی مروت یا لحاظ سے، کسی خوف یا لالچ سے کسی دباؤ یا مصلحت سے کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اکیسویں صدی کیا دو کڑوڑویں صدی اگر آئے گی تو وہ بھی اسلام کو ایسا اور اتنا ہی پائے گی۔ اللہ اس دین کی تکمیل کر چکا ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم — آج ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا

تکمیل کے بعد اس میں شاخسانے پیدا کرنا ایسا ہی ہے کہ کوئی ڈاکٹر سارے ٹسٹ Test کرنے اور مریض کی پچھلی پوری ہسٹری پڑھنے کے بعد اس کے لیے نسخہ تجویز کرے اور مریض اس میں اپنی طرف سے ایک دوا اور بڑھا لے جو ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دواؤں کو بھی بے اثر بنا دے۔ کیا ایسے مریض کو آپ عقلمند سمجھیں گے یا پاگل کہیں گے؟

اس بات پر مخالف تو مطمئن ہوں گے کہ لو ہماری تائید ہو گئی۔ یہ خود کہہ رہے ہیں کہ اسلام جامد مذہب ہے یہ ٹس سے مس ہونا نہیں جانتا، ممکن ہے ہمارے بعض مسلمان بھائیوں کو بھی یہ خیال ہضم نہ ہو سکے اس لیے اب میں اس کا دوسرا پہلو لیتا ہوں۔

اسلام ایک قوت ہے، یہ ہر جمود توڑنے والی، انقلاب پیدا کرنے والی، زندگی بخشنے والی حرکت و عمل پیدا کرنے والی قوت ہے۔ اس کی تفصیل میں جاؤں تو بات بہت طویل ہو جائے گی نہایت اختصار کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام وہ ہے جو ایک یتیم و یسیر بچے، ایک بے سہارا انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے سے آیا، ہر طرح کی تکلیف، ایذا اور قربانیوں کے باوجود زندہ رہا جلا وطن کیا گیا، نئے شہر مدینہ منورہ کی گیارہ سال میں کایا پلٹ دی، سارے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنالیا، آدھی صدی گذری تھی کہ جزیرہ نما سے نکل کر ایران اور مصر پہنچ گیا، ایک صدی میں دنیا کے تین براعظموں پر چھا گیا جس نے سماج کی ہزاروں برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ایک سو سال میں لاکھوں حافظ، قاری، محدث، مفسر، فقیہ، مورخ، جغرافیہ داں، فلسفی، منطقی، ریاضی داں، ماہر فلکیات، طبیب اور سائنس داں پیدا کر دئے، ہزاروں مدرسے قائم ہو گئے۔ صدہا

کتابیں تالیف ہو گئیں ۔ دوسری زبانوں سے علوم اخذ کر کے انہیں بھی محفوظ کر دیا ۔ ایک ایسا معاشرہ بنا دیا جس میں تعلیم اور تربیت شانہ بہ شانہ چلتے تھے ۔ ہمارے قدیم علما کی زندگیوں کا خوب گہری نگاہ سے جائزہ لے لیجئے ان میں ایسے آبرو باختہ اور بدمعاش لوگ شاید ہی ملیں جیسے آج کل کی علمی دنیا میں بغیر ڈھونڈے مل جاتے ہیں ۔ تاریخ اسلام کا ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھ لیجئے خود کشی کا کوئی واقعہ شاذ و نادر ہی مل سکے گا ۔ اس کے مقابلے میں تاریخ اخلاق یورپ پڑھ لیجئے جہاں اجتماعی خود کشی کے سیکڑوں واقعات مل جائیں گے یا اپنے وطن عزیز کی تاریخ کا جائزہ لے لیجئے ، پھر یہ دیکھئے کہ پچھلے ۱۴ سو سال میں جہاں اسلامی حکومت رہی ہے وہاں ۱۴ فرقہ وارانہ فسادات بھی نہیں ہوئے ۔

کیا اتنی بڑی اور نمایاں تبدیلیاں کسی ایسے مذہب کے ذریعے آسکتی تھیں جس میں روح انقلاب کا فقدان ہو ، جو لکیر کا فقیر بن کر جینا سکھاتا ہو ، جس میں ہر ظالمانہ و جابرانہ نظام سے لڑنے کی قوت نہ ہو ، جو اپنے پیروؤں کو توہمات اور خرافات کا اسیر بنانے والا ہو ؟

آپ دنیا کے کسی مذہب کی تاریخ کا جائزہ لے لیجیے کسی نے اتنی تھوڑی مدت میں ، زمین کے اتنے بڑے رقبے پر اور مختلف نسلی ، تہذیبی ، معاشرتی گروہوں پر اتنا فوری اور ایسا دیرپا اثر نہیں ڈالا جیسا آپ اسلام کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہوئے پائیں گے ۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا : گاندھی جی ہوں یا ڈاکٹر امبڈکر یا ہمارے عہد کے دوسرے مفکرین اور مصلحین سب یہ کہتے رہے ہیں ، لکھتے رہے ہیں کہ چھوت چھات برتنا گناہ ہے ، سب انسان برابر ہیں ، سب کے حقوق برابر ہیں ، اس کے خلاف تو آواز کسی نے نہیں اٹھائی ، پھر قانون بھی بنا دیا گیا ۔ آپ کسی انسان سے یہ کہہ دیجیے کہ تم ذلیل نسل کے ہو ، پولیس پکڑ کر بند کر دے ۔ مگر اپنے ماحول پر نگاہ ڈال کر غور سے دیکھیے کیا واقعی چھوت چھات ختم ہو گئی ؟ کیا سچ مچ سب انسان برابر ہو گئے ؟ کیا ہر ایک کو اس کا حق مل گیا ؟ کیا ایک برہمن کسی خاکروب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے لگا ؟ اس کے ساتھ دھیان سے وہ آواز بھی سنیے جو میدان عرفات میں جبل رحمت سے آرہی ہے :

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی کلکم من آدم و آدم من تراب ۔

کسی عرب کو کسی غیر عرب پر ، کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی برتری حاصل نہیں ، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے ۔ برتری کا معیار صرف تقویٰ ہے ۔

کیا اس اعلان کے بعد اسلامی معاشرت میں کوئی نسلی تفریق اور ایسی نفرت نظر آئی جیسی آج بھی یوروپ اور امریکا میں کالے اور گورے انسانوں کے درمیان دیکھی جا سکتی ہے ۔ ؟

یہ ہے اسلام کی انقلاب آفریں قوت ، یہ ہے اس کا قوت و حرکت سے بھرپور اثر ۔۔ اگر میں نے یہ کہا کہ اسلام ایک جامد و منجمد نظریہ ہے جو علی الاطلاق ہر زمان و مکان کے لیے یکساں ہے

پھر یہ کہا کہ اس میں روح انقلاب ہے، تاثیر اور قوت ہے تو ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں دیکھیے سورج غیر متحرک ہے، اپنی جگہ ثابت ہے، مگر سارے نظام پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اسی کی حرارت اور روشنی سے زندگی کی گہما گہمی اور چہل پہل قائم ہے۔ اسی کی تاثیر ذرا سے بیج کو چھتنار درخت بناتی ہے، وہی پھول کھلاتی ہے، فصلیں پکاتی ہے، باران رحمت بن کر چھا جاتی ہے۔ اللہ نے اس کی جو ڈیوٹی مقرر کر دی ہے وہ نہایت وفاداری سے انجام دے رہا ہے۔ اگر خود سورج میں تغیر نہیں پائیں گے تو کیا آپ اس عالمگیر تاثیر اور انقلاب آفریں قوت کے منکر ہو جائیں گے۔؟

اصل میں ہم ایک بڑے مغالطے میں مبتلا ہیں جب تک وہ دور نہیں ہو گا بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ انسانی معاشرت کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ہم اسلام اور مسلم معاشرت کو ایک سمجھ لیتے ہیں حالانکہ دونوں کی جداگانہ حیثیت ہے۔ جمود اگر دور کرنا ہے، اصلاح اگر کرنی ہے، تو موضوع بحث اسلام نہیں، مسلم معاشرت ہونا چاہیئے۔ فرسودگی مسلمان کے ذہن میں آسکتی ہے، پستی اس کے انداز فکر و نظر میں ہو سکتی ہے، خرابی مسلمانوں کے سماج میں ہو سکتی ہے اور ہے۔ میں پھر یہ کہوں گا کہ بہت سی خرابیاں اس لیے آگئی ہیں کہ مسلمان بنیاد پرست نہیں رہا اس لیے جو اس کی خوبی ہوتی وہی طعنہ بن گئی ہے۔ مسند احمد بن حنبل، نسائی اور دارمی کی روایت ہے:

خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لھم خطا ثم قال: ھذا سبیل اللہ ثم خط خطوطا عن یمینہ و عن شمالہ وقال: ھذہ سبل علی کل سبیل منھا شیطان ید عو الیہ، وقراء ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ (مسند احمد، نسائی)

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس لکیر کے دائیں بائیں جانب کچھ اور خطوط کھینچے اور فرمایا: یہ سب دوسرے راستے ہیں، ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان بیٹھا ہے اور تمہیں بلاتا ہے۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس پر چلو اور مختلف راستوں کے پیچھے مت بھاگو ورنہ تم راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔

وہ زمانہ جسے تاریخ اسلام میں خیر القرون کہا گیا ہے عہد رسالت تھا، پھر خلافت راشدہ کا دور آیا پھر تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ۔ اس وقت اسلام تاریخ، تہذیب، معاشرت، غرض زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھا اور سب کچھ اس کے زیر نگیں تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ زمانہ آتا گیا کہ مختلف تہذیبیں اور معاشرتیں اسلامی سوسائٹی پر اثر انداز ہونے لگیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ بقول اکبر الہ آبادی:

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے

صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا دھرا ہے جناب قبلہ ، من
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے
سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولیس
ہے زباں گرم ، قلب ٹھنڈا ہے

اب تک کی گفتگو سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اکیسویں صدی میں اسلام کی نوعیت کیا ہوگی - یہ موضوع بحث نہیں ہو سکتا، البتہ مسلم سماج کے مستقبل پر رائے زنی کی جا سکتی ہے لیکن اس سے پہلے یہ غور فرمالیں کہ ۲۱ ویں صدی کا نعرہ دینے میں سیاسی مصلحت کیا ہے - ؟ اس وقت اقتصادی اور صنعتی و تکنیکی اعتبار سے دنیا تین خانوں میں بٹی ہوئی ہے - کچھ ممالک ترقی یافتہ ہیں جیسے امریکا، جاپان، فرانس وغیرہ، کچھ وہ ہیں جو ترقی پذیر کہے جا سکتے ہیں کسی پر ترقی کا اثر کم کسی پر زیادہ نظر آتا ہے - اس فہرست میں آپ کوریا، مشرقی یورپ کے ممالک اسرائیل وغیرہ کو شامل کر سکتے ہیں - تیسری دنیا وہ ہے جس نے ابھی شاہراہ ترقی پر قدم رکھا ہے اور ان کی منزل مراد ابھی کوسوں دور ہے - ہندوستان بھی اسی راہ پر چل رہا ہے اگرچہ تسلی کے لیے وہ خود کو "ترقی پذیر" یعنی DEVELOPING COUNTRIES میں گنتا ہے ، مگر حقیقت میں UNDER DEVELOPED ہے - جس ملک کی ۷۸ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہو ، جہاں ساڑھے پانچ لاکھ سے زیادہ گانو ہوں - جن تک پکی سڑک نہ جاتی ہو ، جہاں زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد آبادی حرف شناس ہو ، جہاں پچھلے پلان تک صرف ۱۴ روپئے سالانہ فی کس تعلیم پر خرچ کئے گئے ہوں ، جہاں کل آبادی کا ۴۰ فیصد حصہ خط افلاس یعنی POVERTY لائن سے نیچے زندگی بسر کر رہا ہو ، جس کی ۲۰ فیصد آبادی خود کو پس ماندہ یا دلت کہتی ہو ، اور اتنی ہی دوسری اقلیتیں بہت سے حقوق سے محروم رکھی گئی ہوں ، اس ملک کو ترقی پذیر کہنا اپنے نفس کو دھوکہ دینا ہے - معاشی حالت یہ ہے کہ ۴۰ فیصد خط افلاس سے نیچے ہے اور ۴۰ فیصد اس خط کے اوپر ہے جسے انگریزی محاورے میں HAND TO MOUTH ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی طرح جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہے - تقریباً ۲۰ فیصد آبادی کو ہر طرح کی آسودگی میسر ہے اور ملک کی معیشت پر اس کا جابرانہ اقتدار ہے - اس طبقے کے پاس بے حساب دولت ہے - سائنس اور تکنالوجی کی جدید ترین ایجادوں سے یہی طبقہ فائدہ اٹھا رہا ہے ، اس کی دولت ، اس کا طرز زندگی اور اسلوب حیات ہر اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک جیسا بلکہ بعض صورتوں میں اس سے بھی بہتر ہے -

اکیسویں صدی کا مطلب یہ ہوگا کہ ترقی یافتہ دنیا میں آسائش اور تعیش کی جو فراوانی ہے وہ سب ہندوستان کے اس بہ مشکل ۲۰ فیصد طبقے کو میسر ہوگی اس کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرنا کہ ہندوستان بھی ترقی کر گیا ہے جنت الحمقاء میں رہنا ہے یا جان بوجھ کر خود کو فریب میں مبتلا رکھنا ہے۔ اس ملک میں آج بھی لاکھوں انسان بھیک مانگ رہے ہیں، لاکھوں ہیں جو کتے بلی سے بدتر زندگی گذار رہے ہیں، لاکھوں ہیں جو سڑک کی پٹڑی پر راتیں گذارتے ہیں، لاکھوں ہیں جن کو پڑھنا نصیب نہیں ہوا، جنہوں نے پڑھ لیا انہیں کوئی روزگار نصیب نہیں ہوسکا۔ جواہر روزگار یوجنا جیسی کتنی اسکیمیں جتنی کاغذ پر تکمیل پا چکی ہیں اتنی آپ بہ چشم سر نہیں دیکھ سکتے۔ غرض یہ بڑی طویل داستان درد ہے۔ اب غیر ملکی سرمایہ آئے گا وہ متوسط طبقے کو اور مفلس بنائے گا اس لیے کہ وہ بنیادی ضرورت کی اشیا کم پیدا کرے گا، بیوٹی کریم، اسکاچ وسکی اور کوکا کولا جیسی چیزیں زیادہ بنائے گا۔ جو بھی سرمایہ کاری کرے گا وہ اپنی خوش حالی اور معاشی اقتدار قائم کرنے کے لیے کرے گا، میرے آپ کے دلدر دور کرنے کے لیے نہیں۔

یہ مختصر سا نقشہ ہے اس اکیسویں صدی کا جس کے آنے میں پانچ برس اور رہ گئے ہیں۔ اس میں مسلم سماج کا حال کیا ہوگا؟ ساری دنیا کے مسلمانوں کا سماج ایک جیسا نہیں ہے، تقاضے اور ضرورتیں بھی یکساں نہیں ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا کے مسلمان زیادہ تر مہاجر ہیں اور مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں مسلمانوں سے نسلی تعصب برتا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے بھی خود کو اپنے ملک کے لیے ASSET نہیں بنایا، LIABLITY بنے ہوئے ہیں۔

اب رہے تیسری شق کے ممالک ان میں بھی مسلمانوں کی پوزیشن ایک جیسی نہیں ہے کہیں وہ اکثریت میں ہیں اور ان کی اپنی حکومت ہے مگر وہ امریکا کہ شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں، کہیں وہ اقلیت میں ہیں اور اس ملک کی بڑی صنعتوں میں ان کا کوئی نمایاں حصہ نہیں ہے۔ ہر ملک کی صورت حال اتنی مختلف ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں ساری دنیا کے مسلم سماج کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل پر قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔

ہندستانی مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جیسے کسی مریض کو متعدد امراض نے بیک وقت نشانہ بنالیا ہو اور طبیب کی عقل بھی کام نہ کرے کہ پہلے کس مرض کا علاج کیا جائے۔

ضروریات دین سے بے خبری عام ہے، اس لیے اپنے کلچر اور ثقافت سے رشتہ ٹوٹ رہا ہے، اس سے زبان و ادب کو بھی خطرہ ہے۔ جب اپنی حقیقت سے انسان بے خبر ہو تو خود اپنی نگاہ میں بے وقعت ہو جاتا ہے۔ بعض مسائل ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں، منطق کی اصطلاح

میں دور لازم آگیا ہے وہ جو غالب خستہ نے کہا تھا بس وہی آج کے مسلمان کا حال ہے کہ:

پیچھے ڈالی ہے سر رشتہ تقدیر میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بن ناخن تدبیر میں کیل

مسلمان تعلیم میں اتنا پچھڑ گیا ہے کہ اپنی پوری تاریخ میں کبھی اتنا پس ماندہ نہیں رہا۔ تعلیمی پس ماندگی سے اقتصادی بد حالی جڑی ہوئی ہے اور ان دونوں کا ثمرہ ہے سیاست میں بے شعور اور غیر موثر ہونا۔ سیاست میں بے اثر ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ برادران وطن سے سیاسی اور سماجی تعلقات میں استواری نہیں ہوتی۔ سیاست داد و ستد کا کھیل ہے، اس سے فرقہ وارانہ مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اسی بے خبری نے بشریت عامہ کے بین الاقوامی مسائل سے مسلمانوں کو بے تعلق سا کر دیا ہے، ان کے نام نہاد رہنما اردو، مسلم یونیورسٹی، اوقات، پرسنل لا جیسے چند مسائل سے آگے سوچتے ہی نہیں یا شاید انہیں سوچنے کی فرصت نہیں دی جاتی۔ ہندستانی مسلمانوں نے اپنے حصار میں خود کو بند کر لیا ہے۔ بڑے قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ہندستانی پارلیمنٹ میں مسلمان ممبروں کی آواز کبھی نہیں گونجتی۔ اس ملک کی سماجی اقتصادیات میں مسلمانوں کا حصہ کم سے کمتر ہو گیا ہے۔

قوموں کی سیادت کو ناپنے کا اصل پیمانہ ان کے نظریات و افکار ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی نے ایک طرف بلند بینی اور بلند خیالی سے عاری کر دیا ہے دوسری طرف انہیں زود حس اور زود رنج بنا دیا ہے۔ ان کے ایک دم بھڑک اٹھنے کا سبب بے بسی کا غیر شعوری اور شعوری احساس بھی ہے۔

بہت سے لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر وہ پراگندہ اور سراسیمہ ہیں اور ان کی طاقت تھوڑی ہے اس لیے وہ دل شکستہ رہتے ہیں، جن کے جذبات زیادہ شور انگیز ہیں وہ بے بسی کے احساس میں زیادہ مبتلا ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یاس اور شکستہ خاطری کے سبب سے نفسیاتی اور روحانی طور پر ناکارہ ہو جانے کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جب قوت نفاذ ہمارے پاس نہ ہو تو ہوش مندی اور تحمل کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے ورنہ

کون سنتا ہے فغان درویش
قہر درویش بہ جان درویش

ہم نہ کسی بڑی جنگ کو روک سکتے ہیں نہ برسر پیکار حکومتوں سے ان کے ہتھیار چھین سکتے ہیں نہ انہیں ضائع کر سکتے ہیں نہ ممالک کے باہمی جھگڑے ختم کر سکتے ہیں نہ تعلیمی نظام میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ صرف اس کی خرابیوں پر کڑھ سکتے ہیں، انہیں بھگت سکتے ہیں، اس لیے ہمیں

یہ مان لینا چاہیئے کہ حکومت غلط انداز فکر سے چل رہی ہے، اس انداز فکر کو بدلے بغیر نجات ممکن نہیں اور یہ تبدیلی ایک دن میں نہیں آتی، یہ دھرنوں اور مظاہروں، نعروں اور جلسوں سے بھی نہیں آتی - یہ اس طرح آتی ہے کہ ہم صبر و تحمل، ہمت اور برداشت، دور اندیشی اور نظم و ضبط کے ساتھ ایسے خیالات کی پرورش کریں اور تبلیغ کریں جو سب انسانوں کو ترغیب دیں، ان کی کاہلی اور کسل مندی اور شکستہ خاطری کو انقلاب آفریں حوصلے میں بدل دیں۔

اپنے معاشرے میں جو تبدیلی ہم دیکھنا چاہتے ہیں اس کا واضح نقشہ ذہن میں ہونا ضروری ہے - جس نظام کو اکھاڑ پھینکنا ہے اس کی جگہ لینے والا متبادل نظام پہلے سوچنا ہو گا - انقلابی فکر کا یہ خاصہ ہے کہ اگر اس میں وضاحت ہو تو قوت اور تاثیر بھی اس نسبت سے ہوتی ہے - اسلام ایک واضح نظام فکر تھا کہ قرآن کے لفظوں میں قد تبین الرشد من الغی - - - دیکھ لیجیے کیسی برق رفتاری سے سارے عالم پر چھا گیا تھا - یہ سمجھنا کہ ہم کیا ہماری فکر کیا؟ چہ پدی چہ پدی کا شوربا - یہ صحیح نہیں - دنیا کا ہر بڑا انقلابی نظریہ کسی فرد واحد کے ذہن میں پیدا ہوا ہے - وہ سارے نظام جنہوں نے پورے عالم بشریت کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے کسی ایک شخص کے ذہن میں پہلے پہل اپجے ہیں - اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں مگر خیر آپ کارل مارکس اور روسو کو یاد کر لیجیے - دنیا کے پاس کتنے ہی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ہوا کریں مگر آخر کار غلبہ انقلابی فکر کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ عام انسانوں کی بہبود کے لیے جو حل سوچا جائے گا وہ بھلے ہی ہماری زندگی میں برگ و بار نہ لائے مگر ایک اسی کا دور دورہ ہو گا - تاریخ میں اب تک ایسا ہی ہوا ہے - بڑے افکار جان سے بھی زیادہ پیارے ہو جاتے ہیں اسی لیے انسانیت کی تاریخ میں جتنی قربانیاں دی گئی ہیں وہ نظریے کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ہی تھیں - عربی شاعر کہتا ہے:

قف دون رایک فی الحیاۃ مجاھداً
ان الحیاۃ عقیدۃ و جہاد

زندگی میں اپنے اعلیٰ نصب العین پر جہاد کرتے ہوئے جیے رہو، زندگی اسی کا نام ہے کہ ایک مضبوط عقیدہ ہو اور اس کے لیے جہاد کیا جائے - عقیدے کی حفاظت اس طرح کرنی پڑتی ہے جیسے حکومتیں اپنی سرحدوں کی نگرانی کرتی ہیں - مگر یہ دفاعی کوشش باطل عقائد اور مخالف قوتوں سے عقیدہ حقہ کو بچائے رکھنے کے لیے ہوتی ہے، خود باطل عقیدہ جہاد سے بھی قائم نہیں رہتا البتہ سماج میں بگاڑ اور فساد نفرت اور عناد ضرور پیدا کر دیتا ہے جس کی مثال میں بابری مسجد کے قضیے کو یاد کر لیجیے۔

مگر سیاسی اعتبار سے اس قضیے میں مسلمانوں کا موقف کمزور رہا، ڈپلومیسی تو یہ ہوتی ہے کہ

قضیہ حکومت اور رجعت پرست جماعتوں کے درمیان رہتا، مسلمان صرف تماشائی بن جاتے مگر کیا کہیں اور کس سے کہیں ؟ ابن ابی الحقیق مدینے کے یہودیوں میں بڑا شاعر تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کے قبائل کو ان کے ظلم اور استحصال سے نجات دلائی اور انہیں یثرب سے بے دخل کر دیا، اس وقت ابن ابی الحقیق نے اپنی قوم کے بارے میں کچھ اشعار لکھے تھے اور عبرت کا مقام ہے کہ آج وہ اشعار خود مسلمانوں پر صادق آرہے ہیں، اس نے کہا تھا:

سمئت وامسیت رھن الفراش
من جرم قومی ومن مغرم
ومن سفہ الرائی بعد السنیٰ
وعیب الرشاد و لم یفہم
ولو ان قومی اطاعوا الحلیم
لم یتعدوا ولم یظلم
ولکن قومی اطاعوا الغواۃ
حتی تعکس احتل الدم

(ترجمہ: اپنی قوم کے جرم سے اور اس جرم کے بوجھ سے میں تھک چکا ہوں اور بستر سے لگ گیا ہوں سمجھانے کے باوجود ان کی رائے میں پستی سے، کہ انہوں نے نصیحت میں بھی عیب نکالے اور بات کو سمجھ کر ہی نہ دیا۔
اگر میری قوم دانشمندوں کا کہا مان لیتی تو اس پر یہ ظلم نہ ہوتا۔
مگر میری قوم نے تو بہکانے والوں کی پیروی کی۔ انجام یہ ہوا کہ مخالفوں نے ہمیں ڈس لیا۔)

دیمک، شہد کی مکھی اور چیونٹی جیسی حقیر مخلوقات بھی فطرت کے قوانین کی پابندی کرتی ہیں، تنظیم، اتحاد اور سخت اجتماعی محنت ان کے امتیازات ہیں، ہم اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اگر ان حشرات الارض سے بھی گئے گذرے ہوں تو یہ محض "اپنے منہ میاں مٹھو" والی بات ہے۔ شہد کی مکھی کو تنظیم کا درس اللہ نے پوشیدہ طور پر دیا ہے: واوحی ربک الی النحل۔ ہم سے تو ہماری زبان میں اور کھلے لفظوں میں کہا ہے: واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا۔۔ مگر ہم نے سنت الہیہ کی خلاف ورزی کو اپنا شعار بنالیا اور بکھرتے چلے گئے۔ یہی ہمارے زوال و انحطاط کا سبب ہے۔ زوال کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ افراد ہوں یا قومیں جب زوال میں مبتلا ہوتی ہیں تو انہیں اسباب زوال سے محبت ہو جاتی ہے اسی لیے وہ زوال کے بھنور سے نکل نہیں سکتیں۔ ہمیں یہ غور کرنا ہوگا کہ ہمارے اسباب زوال کیا ہیں ؟ اور کیا ہمیں ان سے محبت ہو گئی

ہے ؟ اسلام نے ان سب باتوں کو حرام کر دیا تھا جو امت کے زوال کا سبب ہو سکتی ہیں اور جن کی محبت، ہمیں راہ راست سے بھٹکا سکتی ہے۔ اخوت مساوات تنظیم و اتحاد، تعلیمات اسلامی کی روح ہیں، یہ روح نکل جائے تو ہمارا اسلام کھوکھلا اور بے جان رہ جاتا ہے۔ یہ روح اسلام کی قوت ہی ہے کہ اتنا بکھرنے پر بھی مسلم سماج میں ایک اجتماعی رشتہ موجود ہے۔ پروفیسر کینٹ ویل اسمتھ نے لکھا ہے:

Muslim society has a remarkable solidarity that The loyalty and cohesion of its memberrs are intense. The religious conviction of a muslim implies participation in the grour.
(Islam in modern history p. 18)

مسلمانوں کے مسائل:۔ خصوصاً ہندستان کے مسلم سماج کے حال اور مستقبل پر گفتگو کرنا ایسا ہے۔ جیسے بھڑوں کا چھتا چھیڑ دیا جائے یا مینڈکوں کو ترازو میں تولنے کی کوشش کی جائے، اس لیے میں بھی موضوع سے کچھ دور نکل گیا۔ دراصل جو لوگ ان مسائل پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں ان کے ذہنی اور روحانی کرب کا کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ عربی زبان کے شاعر احمد زکی ابو شادی نے کہا تھا:

وغربۃ الفکر . فی دار یجدھا
اقسیٰ علی الحرمن فقدان ناظرہ

(ایک آزاد انسان جس ملک کی عظمت کے ترانے گاتا ہو، وہاں اس کے افکار کا اجنبی ہو جانا، اس انسان کے اندھا ہو جانے سے بھی بڑی مصیبت ہے۔)

آج سائنس اور تکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہم اپنی آواز لاکھوں میل تک چند سکنڈ میں پہنچا سکتے ہیں مگر انسان کے کانوں سے اس کے دل کا فاصلہ ایک بالشت سے زیادہ نہیں ہے، وہاں تک اپنی بات پہنچا دینا کبھی کبھی پیغمبروں سے بھی ممکن نہ ہو سکا۔

اگر مسلم سماج میں تبدیلی، تغیر، تجدد یا انقلاب کی بات کی جائے تو چند باتوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تغیر اور تجدد قانون فطرت ہے، سنت الہیہ ہے، اسی پر نظام کائنات کا دار و مدار ہے۔ بقول اقبال:

سکوں محال قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

خود انسان کی پیدائش کے مرحلوں پر شروع سے آخر تک غور کرلیجیے، نباتات کو دیکھ لیجیے فطرت ان کے اوراق بھی پلٹتی رہتی ہے، موسموں کو دیکھ لیجیے، ستاروں کا مشاہدہ کرلیجیے، یہی نظر آئے گا کہ ...

آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آینہ دائم نقاب میں

اسی طرح ہر تہذیب اور مذہب اپنے ماضی اور مبہم مستقبل کے درمیان دبا ہوا ہے۔ تہذیبیں بھی پھلتی پھولتی ہیں۔ زور بھرتی ہیں، پھر افسردہ ہوتی ہیں، آخر مردہ ہوجاتی ہیں۔ اب تک کی معلوم ہسٹری میں دنیا کی ۲۸ بڑی تہذیبیں فنا ہوچکی ہیں۔ سماجی انقلاب اور تجدد کا تعلق بھی مذہب سے نہیں تہذیب سے ہے۔ اس لیے تجدد اور تغیر کا انکار یا اس سے چشم پوشی خود قوموں کے حق میں زہر ہوجاتی ہے۔ مگر معاشرت کا تعلق جغرافیہ سے بھی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جس نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے، ہوسکتا ہے وہ ملیشیا یا مراکو کے مسلم سماج کی ضرورت نہ ہو۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ تجدد اور انقلاب میں ڈگری کا فرق ہے۔ انقلاب ہر پرائی روایت کی نفی کردیتا ہے اور دوسرا نظام لے آتا ہے، تجدد اسی رائج نظام کی شریانوں میں نیا خون دوڑانے کا نام ہے۔ تجدد کے نام سے بھڑکنے کی ضرورت نہیں البتہ اس کی حدود اور نوعیت کو متعین کرنا ضروری ہے

تیسری بات یہ کہ تجدد اور اصلاح کی نوعیت کو جانچنے کے دو پیمانے ہیں، مثلاً مسلم معاشرت میں تبدیلی کا ایک اسلامی نقطہ نظر ہوگا، دوسرا غیر اسلامی ... غیر مسلم حلقوں سے بھی اگر اصلاح معاشرہ کی کوئی آواز آتی ہے تو اس پر دھیان ضرور دینا چاہیئے۔ ہماری کمزوریاں اکثر خود ہمیں نظر نہیں آتیں مخالف کی آنکھ پہلے کمزوریوں پر ہی پڑتی ہے۔ پھر، ایک ایسے سماج میں جہاں بھانت بھانت کی زبانیں، مختلف کلچر، رنگا رنگ رسمیں اور مذاہب ہوں، کسی تہذیب کو پھلنے پھولنے کے لیے مفاہمت، رواداری اور تفاعل Interaction کے بغیر چارہ نہیں۔ وہ دنیا جس میں دوسری تہذیب اور مذہب کو نظر انداز کرکے زندہ رہ سکتے تھے ختم ہوچکی ہے، آج زمین کی طنابیں کھنچ چکی ہیں، دنیا بھر کی قوموں اور ملکوں کا ایک دوسرے پر انحصار بڑھ گیا ہے اس لیے دوسروں کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنا اور ان سے سمجھوتا کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ علم بھی اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ اگر ہم دوسرے مذاہب اور تہذیبوں سے باخبر نہ ہوں تو آج کی دنیا کے معیار سے جاہل کہلائیں گے۔

اب آخر میں، دراز نفسی اور سمع خراشی کی معذرت کے ساتھ، دو باتیں اور عرض کروں گا ایک تو یہ آنے والی صدی کے مسائل کیا ہوں گے؟ دوسرے یہ کہ ان حالات میں ہندستان کے

مسلم سماج کو کیا کرنا ہوگا۔

مسائل تو یہ ہیں کہ سرمایہ بڑھے گا، کچھ ممالک اپنی اقتصادی بالادستی میں اور زیادہ مضبوط ہو سکتے ہیں۔ آسائش کا معمولی سامان جیسے موٹر، ٹیلی ویژن، ویڈیو وغیرہ خوش حال ملکوں کے تقریباً ہر گھر میں موجود ہے، اس لیے ان چیزوں کی کھپت انہیں پیدا کرنے والے ملکوں میں کم ہوتی جارہی ہے اور یہ سامان ترقی پذیر ملکوں میں بھی گھر گھر پہنچ چکا ہوگا، غیر ترقی یافتہ ممالک میں ان کے خریدار زیادہ ہوں گے اس لیے ان کی عوامی اقتصادیات کا ایک حصہ اس ذریعے سے صنعتی ملکوں کو ملے گا۔ ترقی یافتہ ممالک اپنی اقتصادی حالت کو مضبوط رکھنے کے لیے بھاری مشینیں اور جنگ میں کام آنے والے زیادہ سے زیادہ مہلک اسلحہ بنائیں گے۔ جو ممالک انہیں خریدیں گے وہ کبھی نہ کبھی ان کا استعمال بھی کریں گے۔ ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کی تعداد و مقدار بھی آج سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔ آبادی بھی اس صدی کے وسط تک دوگنی ہو سکتی ہے۔ بہت زیادہ اندیشے اس بات کے ہیں کہ تیسری عالمگیر جنگ چھڑ جائے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد League of nations کا قیام عمل میں آیا تھا، دوسری جنگ عظیم کے بطن سے U.N.O کا جنم ہوا، اب جو تیسری عالمگیر جنگ ہوگی وہ دنیائے واحد یعنی۔ ONE WORLD - GOVT. کے لیے بڑی حد تک راستہ صاف کر سکتی ہے۔ دنیائے واحد میں بھی محرومیوں اور مسکینوں کو کون پوچھے گا وہ بھی ان ملکوں کا اقتدار ہوگا جو سرمایہ دار ہوں گے، طاقت ور ہوں گے اور صنعتی پیداوار جن کے قبضہ قدرت میں ہوگی۔

اکیسویں صدی میں Globe کے رنگ بہت کچھ بدل جائیں گے۔

سائنس اور تکنالوجی کے قدم اور آگے بڑھ چکے ہوں گے، ممکن ہے کسی دوسرے سیارے میں نوآبادی نظام کی بنیاد پڑ جائے۔ STAR WAR کا بھی خطرہ ہے۔

معاشرتی سطح پر آزادی نسواں میں اضافہ ہوگا جو ملک آج پس ماندہ ہیں ان میں بھی اباحتی معاشرہ Permissive سوسائٹی تیز رفتاری سے بڑھے گی۔ اخلاقیات صرف یونیورسٹی میں تحقیق کا ایک Discipline بن کر رہ جائے گی۔

جنسی سطح پر اباحتی سماج کو بے باپ کے بچے بھی زیادہ ملیں گے۔ ایڈز Aids کی بیماری اور پھیلے گی، طلاق کے واقعات میں اضافہ ہوگا، کیمیاوی کھادوں، ہتھیاروں اور دوسری جراثیم کش دواؤں سے کینسر اور بلڈ پریشر بڑھے گا۔ اعصابی تناؤ بھی آج سے زیادہ ہوگا۔ ہمارے اس عہد کو بھی لوگ "سنہرا زمانہ" کہہ کر یاد کریں گے۔

آنے والی صدی تناؤ تحیر اور Confusion کی صدی ہوگی۔ اس ماحول میں اسلام بہت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ بہ شرطیکہ مسلمان خود کو اس رول کے تیار کر لیں۔ اس نئی صدی

میں اجتہاد کا دروازہ کھولے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اور اس کے لیے ہمارے علما و فقہا کو اپنا رویہ حالات کی رعایت سے نرم اور لچکیلا بنانا ہوگا۔ اب تک مسلم معاشرت دوسری تہذیبوں کے اثرات قبول کرتی رہی ہے، نئی صدی میں دوسری معاشرتیں مسلمانوں سے کچھ سیکھ سکتی ہیں۔ اس دور کے مسائل معاشرتی سطح پر Materialism vs spirituality مادیت بنام روحانیت اور General human ethics vs permissiveness یعنی اباحت بنام انسانی اخلاقیات ہوں گے۔ زندگی پر مادیت کی گرفت سخت ہوجانے پر شدید روحانی پیاس پیدا ہوگی اس کا علاج اسلامی تصوف کے پاس موجود ہے۔ شرطیکہ اسے صحیح ڈھنگ سے اور اخلاص کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ ہمارے علما اور اہل خانقاہ اگر رواج زمانہ کے مطابق عصری مسائل سے آگاہ رہ کر یورپ، امریکا، مشرق بعید وغیرہ میں خاموش مصلحانہ تبلیغ کے لیے نکلیں گے تو انہیں دوسروں کے مقابلے میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

برنارڈ شاہ کا یہ قول تو بہت مشہور ہے کہ مستقبل کے انسان کا مذہب اسلام ہے۔ دنیا کے سامنے اسلام کو جس ڈھنگ سے پیش کرنا چاہیئے تھا وہ ہم نے نہیں کیا ورنہ شا کے اس قول کی صداقت ظاہر ہونے لگتی۔ اسلام میں دنیا کے ہر انسان کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ پروفیسر ولفرڈ کینٹول اسمتھ PROF. WILFRED CANTWEL SMITH نے صحیح لکھا ہے:

„ Manifestly Islam could never have become across the centuries had it not , like the one of the four or five great world religions having something profound and others, had the quality of to say directly to all sorts and conditions relevant and personal and of every status , background, capacity, temperament of men aspiration.„ (Islam in modern history p. 9)

اسلام دنیا کو عظمت انسان کا تصور دیتا ہے اس سے Exploitation پر روک لگتی ہے۔ جنس کے معاملات میں ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دیتا ہے، مگر جنس کو اخلاق اور شریعت دونوں کی شدید نگرانی میں رکھتا ہے اس سے aids جیسا خطرہ کم ہو سکتا ہے۔ مغربی فکر نے کائنات کو ایک خود کار Automatic machine سمجھ لیا ہے جو بے مقصد خود بخود چل رہی ہے۔ اس سے اس نفس کا انکار لازم آتا ہے جس پر مادے کی حقیقت منکشف ہو رہی ہے۔ اگر روح بے حقیقت ہے تو جو کچھ اس پر منکشف ہو رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام ہمیں عرفان نفس کی راہ دکھاتا ہے اور انفس کا رشتہ آفاق سے جوڑتا ہے، وہ روح کو امر رب کہتا ہے اور مادے کے بارے میں کہتا ہے کہ اللہ نے کن (ہوجا) کہا اور یہ کائنات پیدا ہو گئی (فیکون) اس طرح مادہ بھی امر رب ہوا۔ مادہ اور روح دونوں کا درجہ برابر ہوگا۔ پھر نفس یعنی (روح)

کے لیے حدیث میں کہا گیا: من عرف نفسہ فقد عرف ربہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا، اس طرح نفس کی حقیقت اعلیٰ ہو گئی۔ نئی صدی میں تصوف کی اہمیت خصوصاً دوسری اقوام کے لیے بہت زیادہ ہوگی اور اس کے ذریعے سے انہیں اسلام کی آفاقی اقدار اور تعلیمات کی طرف لایا جا سکے گا۔

مستقبل سے مایوس تو نہیں ہونا چاہیئے، مگر کسی تیاری اور مجاہدے کے بغیر خوش آیند مستقبل کے خواب دیکھنا حماقت ہے۔ سب سے پہلا، نہایت اہم، نہایت ضروری کام یہ ہے کہ امت اپنے سارے فضول خرچ بند کر کے اپنی بساط بھر پورا سرمایہ اور پوری کوشش تعلیم کے فروغ میں لگا دے ورنہ اگلی صدی میں بھی اس کا حصہ دور کا جلوہ ہو گا۔ ہم تو خیر قید حیات و بند غم سے چھوٹ چکے ہوں گے اور شاید ایک حسرت و حرمان بھرا دل، زخمی احساس اور کرب آگیں روح اپنے سامان سفر میں لے جائیں گے۔

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

ڈاکٹر تحسین فراقی

جمہوریت اقبال کی نظر میں

دنیا کے متعدد تصورات حکومت میں جمہوریت وہ واحد تصور ہے جس پر لاتعداد مقالات و کتب لکھی جا چکی ہیں اور بے شمار اہل قلم، اہل سیاست اور سماجی سائنسداں اس پر نرم گرم، موافقانہ، مخالفانہ خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ یوں بھی یونان کی یک شہری جمہوریتوں سے لے کر امریکہ کی ڈالر ڈیماکریسی تک یہ نظام حکومت اپنی متنوع اور بعض صورتوں میں کامل متغائر شکلوں میں دنیا کے مختلف خطوں اور منطقوں پر سینکڑوں سال سے حاوی رہا ہے اور ہے۔ جارج بینکرافٹ کے نزدیک تو اس سے زیادہ مقدس کوئی ادارہ نہیں اور ابراہام لنکن کے نزدیک جمہوریت اس دھرتی کی آخری بہترین امید ہے۔ بہرحال اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کی تعریف و مذمت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود جمہوریت کی تاریخ۔

جہاں تک اقبال کا تعلق ہے وہ اس کے جتنے مداح ہیں اس سے کہیں زیادہ اس کے نقاد ہیں۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ جمہوریت کی تحسین کے پس منظر میں علامہ کا بیک وقت وہ حرکی، آتش بجاں اور روایت دوست تصور حیات کارفرما ہے جو جہان تازہ اور امتحان تازہ سے عبارت ہے۔ فرد کی آزادی اور اس کی شخصیت کے لاتعداد امکانات کو بروئے کار لانے میں جو تصور حیات بھی ممد و معاون ہو سکتا ہے علامہ اس وکی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ علامہ کی نگاہ ان سبھی پہلوؤں سے بھی نہیں چوکتی جن میں معیار کے بجائے مقدار اور قابلیت کے بجائے مقبولیت کو طرہ امتیاز قرار دیا جاتا ہے۔

علامہ نے اپنی بھرپور جوانی سے لے کر اپنے رنجور بڑھاپے تک متعدد مواقع پر کہیں نام لے کر اور کہیں بغیر نام لئے جمہوریت کے باب میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ یہ تاثرات نثر کے پیرہن میں بھی ملتے ہیں اور شعر کے پیرائے میں بھی جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان میں ان کے نثری مضامین، شذرات اور بعض مکاتیب بھی شامل ہیں اور پیام مشرق، بانگ درا، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز میں اس موضوع پر لکھی گئی بعض تنکیھی، فکر انگیز اور عبرت خیز نظمیں ہیں۔ اس پورے سرمائے کا، جو بعض صورتوں میں ایک دوسرے کی تائید کرتا اور بعض صورتوں میں ایک دوسرے کو قطع کرتا ہوا نظر آتا ہے، مفصل اور بے لاگ تجزیہ کرنے کے لیے محض ایک مختصر مضمون یا مقالہ کفایت نہیں کر سکتا لیکن اس کے

بعض نمایاں پہلوؤں کا تذکرہ بہرحال ناگزیر ہے۔ اس موضوع کے ضمن میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ علامہ کے اکثر نثری اظہارات کو ان کے شعری تاثرات پر تقدم زمانی حاصل ہے اور اس حوالے سے ان کے تین انگریزی مضامین اور چند شذرات یعنی Islam as a (1909) moral and political ideal (1910) Muslim democracy (1917) Political thought in Islam اور Forms of Government Modern science and democracy اس اعتبار سے لائق توجہ ہیں کہ ان کا دائرہ 1909 سے 1917 تک پھیلا نظر آتا ہے اور یہ زمانہ علامہ کی فکر کی تشکیل کا اہم ترین زمانہ ہے۔ اس زمانے کی مذکورہ تحریروں سے جمہوریت کے باب میں علامہ کے پرجوش خیالات کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ البتہ ان کا اہم مضمون Divine right to rule (1928) میں لکھا گیا، جس میں اقبال نے ظل الٰہی کے روایتی تصور کی نفی کی ہے۔

اول الذکر مضمون یعنی "اسلام ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے" جو جولائی 1909ء میں شائع ہوا، اقبال یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے لیے بہترین طرز حکومت جمہوریت ہی ہو سکتا ہے، کیوں کہ یہی نظام فرد کے تمام امکانات کے ارتقا کی ضمانت دیتا ہے۔

اقبال کے نزدیک خلیفتہ المسلمین منزہ عن الخطا نہیں اس لیے وہ بھی مقررہ قانون کا اسی طرح پابند ہے جس طرح دیگر افراد معاشرہ۔ وہ عوام ہی کا منتخب کردہ ہوتا ہے اور اگر وہ قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے معزول کیا جا سکتا ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

"موجودہ ترکی سلطان کے ایک بزرگ (اشارہ سلطان مراد کی جانب ہے) پر ایک معمار کی درخواست پر عام عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور شہر کے قاضی نے اسے جرمانہ کر دیا تھا۔"

اقبال کے خیال میں اسلام میں کسی "اشرافیہ" کی گنجائش نہیں اور معاشرے کے تمام افراد مساوی ہیں۔ دراصل اقبال جمہوریت میں اسلام ہی کی روح کارفرما دیکھتے ہیں اور اسی لیے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ 1910 میں "ہندوستان ریویو" میں چھپنے والے اپنے مضمون Political thought in Islam میں اس جمہوری روح کی کھوج قبل از اسلام کے اہل عرب میں لگاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کا دماغ موروثی بادشاہت کے تصور سے ابا کرتا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> جب کسی عرب قبیلے کا سردار یا شیخ مرجاتا تو قبیلے کے تمام اکابر ایک جگہ جمع ہوتے اور دائرے کی شکل میں مجلس منعقد کر کے جانشینی کے معاملے میں بحث و تمحیص کرتے۔ قبیلہ کا کوئی رکن، جس کو معتبر و معتقد خاندانوں کے اکابر و رؤسا باتفاق رائے منتخب کر لیتے، قبیلے کا سردار بن سکتا تھا۔ بقول فان

بادشاہت کا مفہوم عرب دل و دماغ سے ہرگز مانوس نہ تھا۔ ہاں کبر سنی اور بزرگی کا اصول جس کو موجودہ سلطنت ترکی کے نظام حکومت میں سلطان احمد اول کے زمانے میں قانوناً تسلیم کر لیا گیا تھا یقیناً انتخاب کے وقت منتخب کرنے والوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔"

اس مضمون میں آگے چل کر اقبال لکھتے ہیں: روایت ہے کہ عامر بن الطفیل حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اگر میں اسلام قبول کر لوں تو مجھے کیا منصب و مرتبہ دیا جائے گا؟ کیا آپؐ اپنے بعد مجھے سرداری سونپ دیں گے؟ حضور اکرمؐ نے فرمایا: "مجھے اس کا ہرگز اختیار نہیں۔

نبی اکرمؐ کے اس ارشاد کی روح آگے چل کر خلفائے راشدین کے یہاں بھی اپنا ظہور کرتی ہے۔ اقبال لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی رحلت سے قبل اپنے جانشین کی نامزدگی کا کام سات انتخاب کنندگان کے سپرد کیا۔ ان سات میں آپ کا اپنا فرزند ارجمند بھی شامل تھا۔ ان سات حضرات کے ذمہ جب یہ اہم کام سپرد کیا گیا تو یہ شرط ساتھ ہی عائد کر دی گئی کہ انتخاب مکمل اتفاق رائے پر مبنی ہوگا اور تم سات میں سے کوئی خلافت کا امیدوار یا دعویدار نہیں ہوگا۔ حضرت عمرؓ کا خود اپنے فرزند کو خلافت کی امیدواری سے مستثنیٰ رکھنا کس قدر روشن اور جلی ثبوت ہے اس الم نشرح حقیقت کا کہ اس زمانے تک عرب کے سیاسی دل و دماغ کو روایتی بادشاہت کے خیال سے قطعاً بعد اور مغائرت تھی۔"

اپنے فکری ارتقا کے اس دور میں اقبال پر جمہوریت کے اثباتی پہلوؤں کا خاصا غلبہ رہا اور تعریف و توصیف کی یہ لے اس قدر بڑھی کہ انہوں نے عہد جدید میں برطانیہ کی جمہوریت پسندی کو ان ممالک پر اس کے احسان عظیم سے تعبیر کیا ہے جو برطانوی غلبے سے قبل بدترین آمریت کے چنگل میں گرفتار تھے۔ اقبال برطانیہ کو انسانیت کے سیاسی ارتقا کا تمدن آموز عنصر قرار دے کر یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ یہ ملک تو دراصل اسی فرض کی تکمیل میں مصروف ہے جسے ہم مسلمان نامساعد حالات کی وجہ سے بجالانے سے قاصر ہو گئے تھے۔ بعد ازاں مغربی استعمار کے سخت ترین نقاد کی حیثیت سے اور مغربی جمہوریت کو بھی ملوکیت اور استعماریت ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل قرار دے کر اقبال نے اپنے اس طرح کے خیالات کا کفارہ بخوبی ادا کر دیا تھا۔

"شذرات فکر اقبال" میں ایک جگہ تصورات کے باہمی اثر و تاثیر اور عمل و تعامل کا ذکر کرتے ہوئے وہ جمہوریت کو نہیں بھولتے۔ فرماتے ہیں:

"تصورات کا ایک دوسرے پر عمل رد عمل ہوتا ہے۔ سیاست میں انفرادیت پرستی کی بڑھی ہوئی رو معاصر سائنسی فکر پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ فکر

جدید کائنات کو زندہ جوہروں کی ایک جمہوریہ قرار دیتی ہے۔"

بعض دانشور جمہوریت کو محض ایک طریق کار یا منہاج قرار دیتے ہیں اور اسے کوئی فلسفہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن جمہوریت کے سرتاپا عشاق اسے ایک ہمہ گیر نظام تک قرار دینے سے نہیں شرمائے۔ جمہوریت کے وکیلوں اور مداحوں نے اسے ایک ایسا نظام حیات ثابت کرنا چاہا ہے جو انسانیت کے تمام دکھوں کا علاج ہے اور اب تو گھریلو جمہوریت کی جگہ "آفاقی جمہوریت" کا صور بھی پھونکا جانے لگا ہے۔ کائنات کو "A Democracy of living Atoms" قرار دینا بھی اسی قبیل کی طرز فکر کا شاخسانہ ہے۔ آخر خلیفہ عبدالحکیم بھی تو اقبال کے تصور جمہوریت کا جائزہ لیتے ہوئے جمہوریت اور اس کی علمبردار مملکت برطانیہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ جمہوریت اب رفتہ رفتہ دین اسلام کی طرح ایک بڑے نصب العین کے قریب پہنچ گئی ہے اور برطانیہ عظمیٰ قابل مبارک باد ہے کہ اس نے اپنی بلیغ حکمت عملی اور غیر معمولی سیاسی بصیرت کی بدولت ہندوستان جیسی وسیع سلطنت کو آزاد کر دیا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ خلیفہ صاحب نے کس سہولت اور بے دردی کے ساتھ فرزندان برعظیم کی غیر معمولی تحریک آزادی کی کاوشوں کی نفی کر دی! واقعہ یہ ہے کہ دین کی کلیت اور ہمہ گیری سے جمہوریت کی کمتریت کو کوئی نسبت نہیں۔

فکر اقبال کا ایک دلچسپ، اہم اور منفرد پہلو یہ ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے سابق و حاضر نظاموں اور فلسفوں میں دلچسپی ضرور لیتے ہیں، ان کے بارے میں کلمات خیر بھی کہتے ہیں مگر ان کے ساتھ زیادہ دیر تک چل نہیں سکتے۔ ان کا یہی معاملہ جمہوریت یا صحیح تر لفظوں میں مغربی جمہوریت سے ہے۔ اقبال اپنے ایک شذرے "مسلم جمہوریت" میں یورپی اور مسلم جمہوریت کا تقابل کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مغربی جمہوریت یورپی معاشروں کی معاشی نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں پیدا ہوئی مگر مسلم جمہوریت معاشی توسیع کے نتیجے میں نہیں بلکہ ایک اصول روحانی کے طور پر مدون ہوئی اور اس کا مقصد فرد کے مخفی امکانات کو ارتقا بخشنا تھا۔ ان کے خیال میں نٹشے جس ادنی طبقے کے فرد سے اظہار نفرت کر کے فوق البشر کی اشرافیت کی توسیع اور افزائش کا قائل ہے، اسی ادنی طبقے سے اسلام نے اعلیٰ ترین حیات اور قوت کے حامل افراد پیدا کئے۔ یہاں نٹشے کے جمہوریت کے سلسلے میں نفرت پر مبنی تصورات کا ملخص اقتباس خارج از دلچسپی نہ ہوگا۔ نہ کہتا ہے:

And as for the state what could have been more ridiculous than this mob - led , passion ridden democracy , this govt by a debating society , this precipitate selection and dismissal and execution

of generals , this unchoiec choice of simple Fermess and trademen , in alphabetical rotation , as members of the supreme court of the land ? How could a new and natural morality be developed in Athena , and how could the state be saved?

نٹشے کی اس مغربی اور محدود جمہوریت کے مقابل اقبال نے جس مسلم جمہوریت کا ذکر کیا ہے اسی کو وہ اپنے چھٹے خطبے --- "in The principle of movement the structure of Islam میں جو نومبر 1929 میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں پڑھا گیا تھا میں "روحانی جمہوریت" قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"ہمیں چاہیئے آج ہم اپنے موقف کو سمجھیں اور اپنی حیات اجتماعیہ کی از سر نو تشکیل، اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں تاآنکہ اس کی وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزواً" ہمارے سامنے آئی ہے یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشوونما جس کا مقصود و منتہا ہے، تکمیل کو پہنچ سکے۔"

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں نہایت اختصار کے ساتھ مغربی جمہوریت کے فکری محرکات کا ذکر کر دیا جائے۔ دراصل ہر طرز حکومت و سیاست کے پیچھے ایک مخصوص تصور حیات و کائنات اور تصور انسان و الہ کارفرما ہوتا ہے۔ معروف معنوں میں جس طرز حکومت کو مغربی جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے یہ مغرب اور بالخصوص صنعتی انقلاب کے بعد مدون ہونا شروع ہوئی۔ عناصر فطرت کی تسخیر نے مغرب کے انسان کو ایک قائم بالذات احساس برتری کا تحفہ دیا اور اس انقلاب کے نتیجے میں مادی اشیا کی ریل پیل نے مادے کو ہمہ مقتدر قاضی الحاجات اور مرکز کائنات قرار دے ڈالا۔ علاوہ ازیں مذہبی سطح پر محرف عیسائیت کے نتیجے میں ہونے والے مذہبی مناقشات نے چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی کا تصور دیا۔ اس صورت حال سے بحیثیت مجموعی درج ذیل نتائج مرتب ہوئے۔

۱) مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

۲) دین اور سیاست الگ الگ تصورات ہیں۔

۳) مادہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔

۴) مذہب کی حیثیت بھی مادی ہے اور یہ منزل من اللہ نہیں۔

۵) منظور ہی موجود ہے اور دنیا سب سے بڑی حقیقت ہے۔

ان نتائج فکر پر مغرب کے معاشرے کی تشکیل جدید ہوئی چنانچہ اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ جس نمونے کا معاشرہ ہوگا اسی نمونے کی عمرانیات مدون ہوگی۔ نتیجتاً جمہوریت کی بھی

وہ عمرانی اور سیاسی صورت وجود میں آئی جس کے محض چند پہلوؤں سے اقبال کو اتفاق ہے۔ اٹھارویں صدی کے انقلاب فرانس میں مساوات، آزادی اور اخوت کے تین خوشنما نعروں کو مغربی جمہوریت نے اصول کی حد تک اور ایک درجے میں عمل کی حد تک اپنایا اور آزادی اور مساوات کے یہی جمہوری اصول اقبال کے لیے کشش کا باعث ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا ہمہ گیر تصور حیات و کائنات کسی جزوی اور کسری چیز سے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کا نثری اور شعری سرمایہ دراصل دو عناصر یعنی Permanent اور Contingent سے تشکیل پاتا ہے۔ وہ باطن کے ساتھ ساتھ خارج میں برپا ہونے والے ہنگاموں اور انقلابیوں کا بھی نہایت گہرا شعور رکھتے تھے۔ چنانچہ آزادی، اخوت اور مساوات کے جمہوری اصولوں کے تمام تر احترام کے باوجود جب وہ "روحانی جمہوریت" پر اصرار کرتے ہیں تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جمہوریت کی مختلف ممالک میں متعارف ہستیوں سے خوش نہیں۔ دراصل مغرب نے نام نہاد سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب برآمد کرنے کے بھیس میں جس طرح بدترین سامراجیت اور زمینی بھوک کا مظاہرہ کیا اور برعظیم کی مخصوص عددی ہندو مسلم صورت حال نے اقبال کے یہاں جو بے چینی پیدا کی اس کا اظہار 1917 کے بعد کی تحریروں میں شدت سے ہوا ہے اور اس باب میں ان کی نظم "خضر راہ" کے بند "سلطنت" اور "سرمایہ و محنت" قابل توجہ ہیں۔

اقبال اول الذکر بند کا آغاز سورہ النمل کی اس آیت کی جانب اشارے سے کرتے ہیں جس کے مطابق جب بادشاہ کسی قریے کو فتح کرتے ہیں تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں اور اہل عزت کی تذلیل کرتے ہیں اور پھر اقبال کے بقول انہیں محکوم بنا کر مختلف چالوں سے ان کے ضمیر کو مردہ اور ان کی انفرادیت کو تہ تیغ کر دیتے ہیں۔ اگلے شعروں میں اقبال نے جمہوریت کے دو دعووں کی نفی کی۔ اول یہ ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ ان کے خیال میں (اور بجا طور [illegible]) [illegible] کا سرچشمہ ذات حق تعالی ہے۔ دوم جمہوریت کے علمبردار جمہوریت [illegible] برعکس دراصل عوام [illegible]

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب

تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں

یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

درج بالا اشعار میں شامل پہلا شعر قرآن حکیم کی درج ذیل آیات ہی کی توضیح و تفسیر ہے:

ان الحکمہ الا للہ ٦: ٥٧

الا لہ الحکمہ وھو اسرع الحسبین ٦: ٢٦

لہ الحمد فی الاولیٰ والاخرۃ ولہ الحکمہ والیہ ترجعون ٧٠: ٢٨

لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شئی قدیر ا: ٦٤

تبٰرک الذی بیدیہ الملک وھو علیٰ کل شئی قدیر ا: ٦٧

جب کہ باقی اشعار میں اقبال عوام کے حقوق، ان کے لیے رعایات، ان کی اصلاح اور ان کے لیے آئین سازی کے ان نام نہاد دعوؤں کی قلعی کھول رہے ہیں جن کے ذریعے آراء سازی Manufacturing of opinion کی جاتی ہے اور عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کا ذکر اقبال سے پہلے لیکی اور شنگلر نے کیا ہے اور ان کے بعد برٹرینڈ رسل کرتا ہے۔ یعنی "بے وقوف ساز خطابت"۔ یہاں سوال الیکشن سے پہلے یا بعد کا نہیں۔ الیکشن سے پہلے عوام کے جذبات سے کھیلنے والا مقرر کیا حربے استعمال کرتا ہے آیئے لیکی کی زبان سے سنیں جس کی کتاب "Democracy and liberty" پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکی کہتا ہے کہ الیکشن میں ایک جذباتی تقریر یا یعنی DEMAGOGUE ووٹر کو اس بات کی ترغیب دینے کی کوشش کرے گا کہ کس طرح کوئی خاص پالیسی لائن اختیار کرنے سے اس کے طبقے کا ہر فرد فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ پھر وہ مسلسل طبقاتی منافرتوں کو ہوا دے گا۔ حسد، ہوس، تعصب اور سیاسی پروپگینڈہ بڑی قوتیں بن کر ابھر آئیں گی۔ ہر حقیقی محرومی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے گا اور ہر خیالی محرومی کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

یہ صورت خطابت صرف جدید جمہوریتوں ہی میں متعارف نہیں، قدیم رومی جمہوریت میں بھی ایک مسلم اور تیر بہدف حربہ تھی چنانچہ شنگلر اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب DECLINE OF THE WEST میں "فلاسفی آف پالیٹکس" کے زیر عنوان لکھتا ہے کہ رومی "لیڈران کرام" عوام کو دھوکہ دے کر متاثر کرنے کے لیے خطابت اور اس کے متعلقات کا سہارا لیتے تھے۔ اس کے خیال میں یہ لوگ ایسے حربے استعمال کرتے تھے جن میں سے اکثر قابل نفرین اور ناقابل برداشت ہیں۔ مثلاً دوران تقریر مصنوعی سسکیاں لینا اور اپنے کپڑے

پھاڑ ڈالنا اور تو اور قیصر روم تک پچاس سال کی عمر میں بھی اپنے سپاہیوں کے لیے یہ کھیل کھیلنے پر مجبور تھا۔ اپنے مخالفین کے بارے میں جھوٹ بولنا، فصاحت کے دریا بہانا، دھمکیاں دینا اور مکے دکھانا بھی اسی کھیل کے مقدس اجزا تھے۔ رسل کا تو خیال ہے کہ خود عوام اسی گرمئ گفتار کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ انگلستان کا ووٹر بد نیتی پرکھنے کے باب میں اندھا ہے۔۔۔ وہ کسی ایسے شخص پر جو لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کرنا چاہتا ہے، کسی ایسے شخص کو ترجیح دیتا ہے جو جاہ طلب مگر شعلہ بیان مقرر ہو اور پھر جب یہ جاہ طلب شعلہ بیان مقرر موثر حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو وہ اپنے اثر کو حکومتی ٹولے کے ہاتھ بیچ ڈالتا ہے۔ رسل دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جسے اصطلاح میں اژدہام کی نفسیات کہتے ہیں اور جس سے کھیل کر طالع آزما لیڈر اپنے مذموم مقاصد حاصل کرتے ہیں۔

اقبال نے "خضر راہ" میں (1921) مغرب کے جمہوری نظام کو قیصری کی جس شکل میں دیکھا اور دکھایا تھا یہی خیال اپنی بعد کی چند شعری تصانیف میں بھی دہرایا ہے مثلاً (پیام مشرق 1923) پس چہ باید کرد (1933) اور ارمغان حجاز (1938) میں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمر کے اس پختہ دور میں مغربی جمہوریت کے سلسلے میں اقبال کے یہاں زیادہ خوش فہمی باقی نہ رہی تھی۔ "پیام مشرق میں قیصر و ولیم کی زبان سے کہلواتے ہیں:

اگر تاج کئی جمہور پوشند
ہماں ہنگامہ با در انجمن ہست

ہوس اندر دل آدم نمیرد
ہماں آتش میان مرز غن ہست

عروس اقتدار سحر فن را
ہماں پیچاک زلف پرشکن ہست

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نبا شد کوہ کن ہست

اسی "پیام مشرق" میں ان کا ایک قطعہ "جمہوریت" کے زیر عنوان شامل ہے جس میں انہوں نے عوام کی عدم بصیرت ان کی خاک افتادگی اور کم نظری کا ماتم کیا ہے۔ اس قطع کے دوسرے شعر کا بالعموم بار بار حوالہ آتا ہے یعنی:

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

اس شعر کے پس منظر میں جہاں آدمی اور انسان کے گہرے روایتی تفاوت کی طرف اشارہ ہے وہیں اس حقیقت کا بھی واشگاف اعلان ہے کہ گھٹیا سے بڑھیا کا صدور ناممکن ہے۔ مطلب نکالنے والوں نے تو اس شعر سے یہ مطلب بھی نکالا ہے کہ علامہ "غلام پختہ کارے شو" کا سبق دیکر آمریت سے اپنی وابستگی کا اعلان کر رہے ہیں لیکن وہ اسے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے سے ملا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے جس میں چیونٹی کی رعایت سے "طبع سلیمان" کا ذکر کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی حاکمیت کا دائرہ اتنا وسیع اور ان کے روحانی تصرفات کا تنوع اتنا حیرت انگیز ہے کہ "سلیمان" ایک فرد کا نہیں ایک علامت کا نام بن گیا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر وہ وسعت نظری جس میں مشورت کی حیثیت بنیادی تھی اور جسے ایک ایسا اعلیٰ جمہوری رویہ قرار دیا جا سکتا ہے جس میں انسانوں ہی کا نہیں حیوانوں اور پرندوں کا موقف بھی تحمل سے سننے کی روایت موجود ہے۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہو گا کہ حضرت سلیمانؑ جیسے جلیل القدر، خدا ترس، وسیع النظر، بسیط العلم، صاحب بصیرت علامتوں کی زبان کے فہام اور صاحب اسم اعظم کو تنگ نظر، عیاش، خونخوار، مکار اور دوں فطرت آمروں اور شہنشاہوں پر قیاس کیا جائے۔ پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ مطلوبہ اور مناسب تعلیم و تربیت اور تہذیب نفس کے بغیر کم نظر عوام کی رائے کی حیثیت محض عددی اور مقداری ہوتی ہے۔ معیاری اور معروضی نہیں۔ آخر کار رسل جیسے بالغ نظر ادیب و مورخ کو بھی تو کہنا پڑا تھا:

There are nine fools for every wise man.
Democracy is the rule of the fools.

اور پھر اسی عددی اور مقداری اکثریت کو بالزاک کے ہم پلہ عظیم فرانسیسی ناول نگار ہنری بیل BEYLE نے جو دنیائے ادب میں استاں دال کے نام سے معروف ہے، ہدف تنقید بنایا تھا اور جسے اقبال نے ضرب کلیم میں منظوم کر دیا تھا۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ اسی عددی کثرت کے اصول نے انسان کو ایک ریاضیاتی اکائی کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے اور ایک ایسی متوسطیت کو جنم دیا ہے جس پر بیسویں صدی کے متعدد ممتاز دانشوروں مثلاً لارنس، آرتیگا، نی گیزے، رینے گیوں اور رسل نے اظہار افسوس کیا ہے۔ گینول نے کس قدر درست لکھا تھا کہ تعداد و کثرت کو جب اپنے اصول سے الگ کر دیا جائے اور وہ اس قابل نہ رہے کہ اسے وحدت میں تبدیل کیا جا سکے تو سماج میں اس کی حیثیت ایک ایسے گروہ کی رہ جاتی ہے جو اجزائے محض ایک ریاضیاتی مجموعے سے

زیادہ نہیں ہوتی اور کسی گروہ کی یہ حیثیت محض اس وجہ سے ہو جاتی ہے کہ اس کا رشتہ اصول ارفع سے ٹوٹ جاتا ہے۔ نتیجتاً گروہوں کے تصادم تعداد اور شدت میں بڑھ جاتے ہیں۔ رسل نے اکثریت کے اسی جبر کو ایک حقیقی خطرہ قرار دیا تھا۔ وہ اپنی کتاب پولیٹیکل آئیڈیلز میں لکھتا ہے کہ جمہوریت کا تصور اکثریت انسانیت کے لیے مہلک اور جان لیوا تصور ہے۔ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اکثریت ہمیشہ درست کہتی ہے۔ ہر نئے مسئلے میں اکثریت ہمیشہ غلطی کرتی ہے۔ یہی بات مارٹن بیوبر نے کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں اکثریت میں ہرگز یقین نہیں رکھتا کیوں کہ میرا خیال ہے کہ اکثریت شاید حق پر نہیں ہوتی۔ اقبال نے اس سے ملتا جلتا خیال "شذرات" میں پیش کیا تھا۔ ان کی رائے میں اکثریت میں صلابت کردار ممکن نہیں رہتی کیوں کہ کردار ایک قوت ہے اور جوں جوں یہ تقسیم ہوتی ہے، کمزور ہوتی جاتی ہے۔

"پس چہ باید کرد" میں سیاسیات حاضرہ" کے زیر عنوان اقبال "عروس اقتدار سحر فن" کی ساحری اور حربہ، نظر بندی اور اس کی گرم گفتاری کو بے نقاب کرتے ہیں اور عوام کو ان کے "دام ہمرنگ زمیں" سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک سیاست حاضرہ بند غلامی کو سخت تر کر دیتی ہے اور بے بصر اس کو حریت کا نام دے کر فریب نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مزید فرماتے ہیں:

گرمئ ہنگامہ جمہور دید
پردہ بر روئے ملوکیت کشید

در خفایش بال و پر نتواں کشود
با کلیدش بیچ در نتواں کشود

گفت بامرغ قفس اے درد مند
آشیاں در خانہ صیاد بند

ہر کہ سازد آشیاں در دشت مرغ
او نبا شد ایمن از شاہیں و چرغ

از فسونش مرغ زیرک دانہ مست
نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست

حریت خواہی ؟ بہ پیچ کش مفیت
تشنہ میرو برنم تاکش مفیت

واہ کیسی جمہوریت ہے جو مرغ قفس کو آزادی کا جھانسا دینے کے لیے اسے خانہ ، صیاد میں آشیاں سازی کا مشورہ دیتی ہے اور دشت و گلزار میں آشیاں بندی سے اس لیے روکتی ہے کہ وہاں شاہین و چرغ کے ہاتھوں جان کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے! جمہوریت کا یہ مشورہ مرغ قفس پر اس کا ایسا احسان ہے جو مجھے حالی کا ایک شعر یاد دلاتا ہے:

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
اس کو دیکھ کے تیرے سارے احساں آگئے یاد ہمیں

" ارمغان حجاز " میں بھی جو اقبال کا آخری شعری کارنامہ ہے ، اقبال نے جمہوریت کو ملوکیت کا پردہ قرار دیا ہے ۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ کے دوسرے مشیر کے اس سوال کے جواب میں کہ " سلطانی ، جمہور " کے شور و غوغا کی حقیقت کیا ہے ، پہلا مشیر کمال بصیرت سے اس تصور کی پردہ کشائی کرتا ہے:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلس ملت ہو یا پرویز کا روبار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اقبال نے جمہوریت پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں مگر آخری شعر میں کیا گیا اعتراض اپنی شدت کے اعتبار سے بری طرح جھنجھوڑ دینے والا ہے ۔ اور اس آخری مصرعے میں جمہوریت کے نام پر کمزوروں اور زیر دستوں پر ظلم و ستم اور ان کے لرزہ خیز استحصال کی ایک بھیانک تصویر

سامنے آتی ہے۔

یہاں اگر مجھے تھوڑے سے گریز کی اجازت دی جائے تو میں انیسویں صدی کے معروف امریکی شاعر والٹر وٹمین کی مشہور نظم "For you o , Democracy" کی کچھ سطریں آپ کو سنادوں جو دراصل امریکی جمہوریت کے منور شاعر کا قصیدہ مدحیہ ہے اور جس سے جمہوریت سے اس کی غیر معمولی عقیدت کا اظہار ہے۔ شاعر کہتا ہے:

"آؤ ادھر آ، میں اس خطے کو ناقابل شکست بنادوں گا۔ میں زمین کو بہترین اور پرکشش بنا دوں گا۔ میں دوستداری کے وہ پودے کاشت کروں گا جن سے امریکی دریاؤں کے کنارے گھنے درخت اگیں گے ۰۰۰ اور میں شہروں کو یوں بہم کردوں گا کہ وہ اپنے بازو ایک دوسرے کی گردن میں حمائل کردیں گے۔ اے جمہوریت میری جانب سے یہ گیت تیری نذر ہیں۔ میں تیری یہی خدمت کرسکتا ہوں۔"

شاعر کی اس خدمت سے سے انکار ہے مگر خود جمہوریت نے مغرب و مشرق کی جو "خدمت" کی ہے وہ اس خوفناک تصادم کی شکل میں سامنے آئی ہے جس نے مغرب کی سرزمین کو دو بڑی جنگوں کے نتیجے میں خون انسانی سے لالہ زار بنا دیا اور جو اپنی نظری ہیئت میں بھی اس تصادم کی شکل میں بھی اس تصادم سے عبارت ہے جو حزب اقتدار اور حزب اختلاف میں وہ صورت اختیار کرتا ہے کہ نفرتیں دلوں میں ناسور ڈال دیتی ہیں اور ذہنوں میں حسد کی آگ کا الاؤ بھڑک اٹھتا ہے۔ اسلام کا طرز سیاست اناؤں اور غرضوں کے اس تصادم کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ کیا ستم ہے کہ ملکی اور ملی مفادات کی قیمت پر شخصی اور ذاتی اناؤں کے تصادم کا وہ طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو سالہا سال بھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ عجیب بات ہے کہ وہ جمہوری نصب العین جو رنگ و نسل کی تفریق ختم کرکے انسانی بھائی چارہ قائم کرنے اور دوستداری اور مساوات کے پودے کاشت کرنے کے لیے اٹھا تھا۔ اس نے تصادم، استحصال اور ظلم و تعدی کے نئے ریکارڈ قائم کرنا شروع کردئے۔ دیکھئے اقبال اس باب میں مغربی جمہوریت کے خلاف کیسی سنگین فرد جرم عائد کرتے ہیں۔ "گلشن راز جدید" کے چند شعر دیکھئے

فرنگ آئین جمہوری نہا دست
رسن از گردن دیوے کشادست

زباغش - کشت ویرانے نکوتر
ز شہراو بیابانے نکوتر

رواں خوابید و تن بیدار گردید

ہنر با دین و دانش خوار گردید
گروہے راگروہے در کمین است
خدا یش یار اگر کارش چنین است

زمن وہ اہل مغرب را پیامے
کہ جمہور است تیغ بے نیامے

چہ شمشیر کہ جانہا می ستاند
تمیز مسلم و کافر نداند

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے جمہوریت روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرتی ہے اور اس کی حیثیت اس شمشیر کی سی ہے جس کا کام مارنا کاٹنا ہے خواہ سامنے مسلم ہو یا کافر۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کا اسٹینڈرڈ وہ متوسط آدمی ہے جس کی ضروریات اس طرز حکومت کے نزدیک محض روٹی، کپڑا، مکان اور کھیلنے کھانے اور کام کاج کے لیے مناسب سہولتوں کی فراہمی ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ جاننے والا اور نہ جاننے والا برابر نہیں ہو سکتے لیکن جمہوریت عالم اور عامی دونوں کے ووٹ کی مساوی قیمت لگاتی ہے۔ لارنس نے کس دلسوزی سے کہا تھا کہ انگلستان، فرانس اور جرمنی۔۔۔ ان عظیم اقوام کے اب کوئی حقیقی معنی نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ وسیع ہجوم آبادی کی مادی خواہشات کی تشفی کے لیے فوڈ اور ہاؤسنگ کمیٹیوں کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔

اقبال کے نزدیک عہد جدید کا المیہ یہ ہے کہ وہ خودی سے دور اور ذوق یقیں سے عاری ہو چکا ہے اور ذوق جمہور اس کا رہبر ہے۔

از خودی دور است و رنجور است و بس
رہبر او ذوق جمہور است و بس

واقعہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مغربی جمہوریت کی مخالفت کے ضمن میں اقبال کے یہاں شدت پیدا ہوتی گئی اور وہ اس سے مزید بدظن ہوتے گئے چنانچہ "جاوید نامہ" میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ

فرنگ مہور دستور بے
مردہ تر شد مردہ از صور فرنگ

اس بڑھتی ہوئی بے اطمنانی کا سبب دراصل اس "خادمہ۔ کثرت" کے وہ جرائم تھے جن میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بتدریج اضافہ ہو رہا تھا جس کا اظہار انہوں نے اس دور میں متعدد مواقع پر کیا۔ صرف چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ سید نذیر نیازی کے ساتھ مسجد شہید گنج کے مسئلہ پر ایک موقع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

"ہماری حالت تو جو ہے سو ہے لیکن اس انگریزی حکومت کو دیکھئے جسے ڈیما کریسی اور رائے عامہ کے احترام کا دعویٰ ہے۔ اگر ڈیما کریسی کی یہی شان ہے جس کا ثبوت حکومت دے رہی ہے تو ایسی ڈیما کریسی کسی شریف قوم میں پرورش نہیں پا سکتی۔"

اپنے چھٹے خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" میں نسبتاً ہلکے پیرائے میں اس صورت حال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یورپ کی تصوریت ایک زندہ حقیقت نہ بن سکی اور مغرب کی غیر روادار جمہوریتوں کی وجہ سے ایک ایسی گمراہ انا پیدا ہوئی جس کا مقصد وحید غریب کا استحصال کرنا تھا۔ فرماتے ہیں کہ میرا ایمان ہے کہ یورپ آج انسانیت کے اخلاقی ارتقا میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ انہوں نے اسی لمبے کا ذکر "پس چہ باید کرد" میں بھی چند سال بعد "استحصال" ہی کے زیر عنوان کیا اور اپنے موقف کو ایک بار پھر دہرایا۔ لگتا ہے کہ جس شیوہ۔ تہذیب نو کی وہ مذمت کرتے ہیں وہ دراصل شیوہ۔ جمہوریت ہی ہے کیوں کہ ضرب کلیم میں انہوں نے مغرب کے امراض کا سبب جمہوری نظام ہی کو قرار دیا تھا:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

دیکھئے کس سہولت سے مولانا روم کے ایک مصرعے "فکر ہم بر فکر دیگر می چرد" میں تصرف کر کے اپنی معاصر صورت حال کا ذکر کرتے ہیں اور کس دلسوزی سے:

امتے بر امت دیگر چرد
دانہ ایں می کارواں حاصل برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است
از تن شاں جاں ربودن حکمت است

شیوہ ٔ تہذیب نو آدم دری است
پردہ ٔ آدم دری سوداگری است

اور کیا یہ حیرت خیز بات نہیں کہ مغرب کی اس سوداگری کا اندازہ اقبال کو اوائل عمری ہی میں ہو گیا تھا۔ وہ اس کے اظہار میں بے باک بھی تھے۔ چنانچہ بانگ درا کے دوسرے دور کی آخری غزل (مارچ 1907) کا یہ شعر کسے یاد نہ ہوگا:

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

مغرب کی اس عقل عیار، مادہ پرستی اور استحصالی نظام سیاست کو دیکھ کر ابلیس کو اپنا اعلان شکست کرتے ہوئے خداوند جہاں سے عرض کرنا پڑتا تھا کہ

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہہ افلاک

اقبال نے اپنے آخری شعری کارنامے میں مغرب کے جمہوری نظام کے باطن کو چنگیز سے تاریک تر قرار دیا تھا۔ اس کی متعدد وجوہات اوپر بیان ہوئیں لیکن اگر خود اقبال ہی کے الفاظ میں اس کا تجزیہ مقصود ہو تو وہ یہ ہے کہ

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس شعر کے پہلے مصرعے میں ""جمہوری تماشا" کی ترکیب بے حد قابل غور ہے۔ اقبال جیسا قادر الکلام شاعر "تماشا" کی جگہ کوئی اور لفظ بڑی آسانی سے لا سکتا تھا۔ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا کہ " جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری حکومت ہو " لیکن " تماشا " کا لفظ استعمال کر کے اقبال جہاں ایک طرف یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ جمہوریت کے نام پر مغرب میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ محض بازی گری ہے اور اس کا جمہوریت کی روح سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ وہاں دوسرے مصرعے میں اپنے اس موقف کو دہرا رہے تھے جسے 1929 میں انہوں نے "روحانی جمہوریت" کا نام دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی انگلیوں کی پوروں تک مجسم التہاب و انقلاب اقبال زمانے کے گہرے نبض شناس تھے۔ جس زمانے میں اقبال نے مندرجہ بالا شعر کہا عین اسی زمانے میں مغرب میں جمہوریت کی ناکامی اور بعض ممالک میں ڈکٹیٹرشپ کے قیام پر ان کا اضطراب خطوں میں ڈھل رہا تھا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ کو راغب احسن کے نام لکھتے ہیں:

"دنیا اس وقت نئی تشکیل کی محتاج ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن بھی ایک کشمکش میں مبتلا ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں دنیا کی جدید تشکیل میں اسلام کیا مدد کر سکتا ہے۔"

بالکل اسی مضمون اور اسی تاریخ کا خط سید سلیمان ندوی کے نام بھی ملتا ہے۔ وہی سید سلیمان ندوی جسے اقبال جدید ہندوستان میں اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد کہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالت نزع میں ہے۔ غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے۔"

یوں کہنے کو اقبال خود یہ کہتے ہیں اور کم و بیش اسی زمانے میں کہ:

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

اور یہ بھی کہ

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں
کنیز اہرمن و دوں نہاد و تیرہ ضمیر

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

لیکن اوپر کے خطوط اور ان اشعار میں وہی فرق ہے جو تفصیلات طے کرنے کے اضطراب

اور اجمالی بیان میں ہوتا ہے۔ حضرات! حق یہ ہے کہ اقبال نہ تو سیاست دین کے قائل تھے نہ سیاست لادین کے۔ وہ سیاست میں دین کے نظریے کے موید تھے۔ ان کے خیال میں لادین دنیا نام کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ راغب احسن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: "اگر سیاست اسلام کی خادم نہ ہو تو میری نگاہوں میں محض الحاد ہے"۔ اپنے شہرہ آفاق چھٹے خطبے میں کہتے ہیں:

" There is no such thing as a profane world . All this immensity of matter constitutes a scope for the realization of spirit . All is holy ground . As the prophet so beautifully puts it . The whole of this earth is a mosque. " The state according to Islam is only an effort to realize the spritual in a human organization . "

اقبال کی مشہور نثری تحریریں اور شعری اظہارات اس کے گواہ ہیں کہ ان کے نظام فکر میں روحانیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے تمام معاشی اور عمرانی تصورات اسی کے تابع ہیں۔ نظری طور پر جمہوریت کے قائل ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی متعارف مغربی تعبیرات کے شدید ترین نقاد تھے۔ وہ اس کا رشتہ وحی الہی سے جوڑ دینا چاہتے تھے۔ اس وحی الہی سے جس کے بارے میں خود انہوں نے "جاوید نامہ" میں فرمایا تھا۔

وحی حق بینندہ سود ہمہ
در نگاہش سود و بہبود ہمہ

یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ بر عظیم کے پس منظر میں علامہ کے بعض ارشادات ہی کو کلی حقیقت سمجھ کر ان کے جمہوریت کے باب میں مخالفانہ خیالات کی تاویل مناسب نہیں۔ اقبال کی جمہوریت کے باب میں مخالفت کو محض بر عظیم کے ایک خاص تناظر سے جوڑنے والے دانشور ان کی سیاسی فکر کو ابدی عنصر Permanent سے کاٹ کر ہنگامی عنصر Contigent سے جوڑنے کا ایک رخا کارنامہ انجام دے رہے ہیں جو علمی بد دیانتی یا ہلکے لفظوں میں جزوی صداقت کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اقبال نفاذ اسلام کے لیے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیش نظر اجتہاد کی ضرورت کا شدت سے احساس رکھتے تھے چنانچہ اپنے محولہ بالا چھٹے خطبے میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلی صدی ہجری کے وسط سے چوتھی صدی ہجری تک اسلام میں انیس مکاتیب فقہ وجود میں آچکے تھے

اور فقہائے کرام بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تمدنی ضروریات کی روشنی میں اسد کی نئی تعبیرات کا ان تھک فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اس لیے اب یہ سمجھنا کہ جو کچھ ہمارے عظیم فقہا لکھ گئے ہیں، ان سے انحراف نہیں کیا جا سکتا، درست نہیں۔ اسی خطبے میں انہوں نے جمہوری طرز حکومت کو اسلام کی روح کے مطابق قرار دیا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرز حکومت کی متعدد اشعار میں مذمت اور دوسری جانب اسے اسلام کی روح کے مطابق قرار دینا بظاہر اجتماع نقیضین کے مترادف ہے لیکن غور کیا جائے تو اس امر میں کوئی اشکال نہیں رہتا کیوں کہ اقبال جمہوریت کی روح یعنی حریت فکر و عمل (بحیثیت ایک اصول کے) کے تو قائل ہیں مگر اس کے عملی مغربی مظاہر کے نقاد۔ ان کے نزدیک توحید کا جوہر مساوات، تمکین اور حریت ہے اور جمہوریت کے اصولی فکری نظام میں وہ انہی عناصر کو موجود پا کر اس کی تعریف کرتے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت کے نہایت اہم طریق کار یعنی انتخابات کے بارے میں اقبال کے تصورات کیا ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں یا تو ان کے ان ارشادات سے کچھ روشنی ملتی ہے جو وقتاً فوقتاً پنجاب لیجسلیٹیو کونسل میں سامنے آئے یا پھر ان کے مضمون Political thought in Islam سے رجوع کرنا مناسب رہے گا۔ مذکورہ مضمون میں اقبال نے الیکشن کے باب میں الماوردی کے خیالات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے اور چونکہ ان پر اپنی کوئی رائے نہیں دی اس لیے انہیں جزواً علامہ ہی کے خیالات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ الماوردی مسلم معاشرے کو "منتخب کنندگان" اور "امیدواران انتخاب" میں تقسیم کرتا ہے اور اس کے لیے پہلی شرط بے داغ کردار کی لگاتا ہے اور پھر امیدوار کے لیے باقی شرائط گنواتا ہے جن میں چند ایک یہ ہیں:

۱) امیدوار ذہناً اور جسماً صحت مند ہو۔
۲) ضروری قانونی اور فقہی علم رکھتا ہو۔
۳) صاحب بصیرت ہو۔
۴) صنف کرخت سے تعلق رکھتا ہو یعنی مرد ہو (معلوم نہیں اقبال کے لیے یہ شرط قابل قبول ہوئی یا نہیں)

اگر بقول ماوردی امیدوار ان تمام شرائط کو پورا کر دے تو پھر تمام صاحب اثر خاندانوں کے نمائندے، ریاست کے اہم عہدیدار اور فوج کے سپہ سالار باہم مل بیٹھیں اور امیدوار کو خلافت کے لیے چن لیں۔

دنیائے اسلام الماوردی کے ان خیالات سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔

خود علامہ نے جب ۱۹۲۶ میں پنجاب کونسل کے امیدوار کے لیے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا تو امیدوار کا سب سے بڑا وصف یہ بیان کیا کہ اسے ذاتی اور قومی منفعت کی ٹکر کے وقت اپنے شخصی مفاد کو مقاصد قوم پر قربان کر دینا چاہیئے۔ جہاں تک اجتہاد کا تعلق ہے اقبال نے اپنے چھٹے خطبے میں اس کا اختیار قانون ساز اسمبلی کو سونپ دیا ہے۔

میرے خیال میں اس فیصلے کا سبب دراصل ہمارے علمائے کرام کا وہ شدید باہمی اختلاف و نزاع ہے جس سے اقبال بڑے دل گرفتہ تھے۔ وہ راغب احسن کے نام خطوں میں ایک سے زیادہ دفعہ اس افسوسناک صورت حال کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک موقعے پر لکھتے ہیں:

"افسوس علمائے اسلام میں رجال سیاسی سے بھی زیادہ اختلاف ہے:

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے میں ملا ہوں غازی

لیکن انہیں اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ جدید مسلم اسمبلیوں میں ایسے افراد کثرت سے ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے سرے سے واقف نہ ہوں گے۔ اور نتیجتاً شدید اور خوفناک منفی تعبیرات دین کا اندیشہ لاحق ہو گا چنانچہ انہوں نے اس کا یہ حل تجویز کیا ہے کہ علما بھی مسلم قانون ساز اسمبلی کا جزو لازم ہوں تاکہ قانون سازی میں ممد اور معاون ہو سکیں لیکن وہ برتری بہرحال اسمبلی ہی کو عطا کرتے ہیں۔ اور اسی کے فیصلوں کو "اجماع" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صرف اسی صورت میں، ہم اپنے فقہی اور قانون جمود کو توڑ کر اپنی خفتہ توانائی کو متحرک کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں مسئلے کا یہ محض جزوی حل ہے۔ جب تک ہمارے نظام تعلیم کی دوئی وحدت میں نہیں بدلتی اس میں سچی اسلامی تعلیمات کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہو جاتی اور ایک بڑی کرداری اور روحانی تبدیلی افراد میں واقع نہیں ہوتی، ہمارا تہذیبی اور سیاسی انتشار رفع نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کے باب میں اقبال نے بعض معاملات اور مسائل پر بوجوہ روشنی نہیں ڈالی۔ مثلاً یہ کہ ۱) کیا اسلام میں سیاسی پارٹی بندی کی گنجائش ہے؟ ۲) کیا ایک حد درجہ ناخواندہ اور غیر مہذب معاشرے میں ہر شخص کو ووٹ کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ ۳) کیا ایک طبقاتی معاشرے میں جو از سر تا پا جاگیردار یا سرمایہ کار کی گرفت میں ہو۔ جمہوریت کے ذریعے صالح، خدا ترس، خدا جو، انصاف پسند اور عادل قیادت بروئے کار لائی جا سکتی ہے؟ یہ اور اسی طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کے اقبال کے یہاں جواب فراہم نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود جمہوریت کے باب میں ان کے بعض نہایت قابل قدر خیالات کی روشنی میں عہد جدید میں اسلامی

نظام حکومت کی اصولی تدوین ابھی امت مسلمہ پر قرض ہے۔ دیکھئے یہ قرض کب ادا ہوتا ہے؟ سر دست تو حالت یہ ہے کہ:

میر سپاہ نا سزا لشکریاں شکستہ صرف
آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

مصحف اقبال توصیفی

ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ایک مطالعہ

اردو کے ایک شاعر تھے میر محمد تقی، ایک نقاد تھے محمد حسن عسکری، عسکری صاحب نے میر کے بارے میں لکھا ہے کہ میر کو پڑھنا خود سے عمر بھر کا جھگڑا مول لینا ہے، آئیے! عسکری صاحب کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں یہ اضافہ کریں کہ اگر میر کو پڑھنا خود سے عمر بھر کی لڑائی ہے تو اقبال کو پڑھنا ساری دنیا سے عمر بھر کی لڑائی مول لینا ہے۔ کیوں کہ اقبال اسلام کے سوا ہر نظام فکر اور فلسفہ حیات کو باطل ہی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ جہاد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ میر کا مرکز تاثر داخلی ہے، میر کا شعر پہلے آپ کی رگ و پے میں سرایت کرتا ہے پھر آپ کے دل کو روشن کرتا ہوا آپ کے حواس اور دماغ کو بیدار کرتا ہے اور آپ کے گرد جو اشیا ہیں، یہ زمین، یہ کائنات، ان سب سے آپ کا ایک انوکھا رشتہ استوار کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں یہ عمل معکوس ہے۔ اقبال کا مرکز تاثر خارجی ہے۔ وہ پہلے خود اس زمین اور کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں، اشیا کو معنی کی ڈور میں پروتے ہیں اور جب سارے اسرار حیات ان کے قلب پر آئینہ ہو جاتے ہیں تو وہ عقل کی راہ سے آپ کے دل تک پہنچتے ہیں، ایسے جیسے کنواں پیاسے کے پاس آئے۔ اس لیے وہ یہ دشوار سفر تنہا طے کرتے ہیں۔ دانش مندی کا یہی تقاضا تھا، اقبال کے پاس جو بے پناہ علم ہے اور کشف ذات و کائنات کے جن پہلوؤں تک ان کی رسائی ہوئی ہے، ہمارے لیے ان کی ایک جھلک پانے کا یہی ایک وسیلہ تھا، لیکن اقبال کا کمال یہ نہیں کہ وہ بہت بڑے عالم، فلسفی یا دانش ور تھے بلکہ یہ کہ وہ اپنے علم، فلسفہ اور دانش کا نچوڑ اپنے اشعار کے ذریعہ اپنی قوم کے رگ و پے میں منتقل کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ اگر میر کی شاعری آپ کی جڑیں زمین میں گہری کر کے آپ کو اونچا اٹھا سکتی ہے تو اقبال کی شاعری آسمان سے اتر کر آپ کا ہاتھ تھام لیتی ہے، پھر وہ آپ کو ان مقامات کی سیر کراتے ہیں جن کی تلاش میں وہ کبھی تنہا سفر پر نکلے تھے۔ اسی لیے اقبال کا اسلوب اپنے تمام پیشروؤں سے (جن میں میر بھی شامل ہیں) مختلف ہے۔ اقبال جس سطح سے خطاب کرتے ہیں، ہمیں گردن اٹھا کر انہیں دیکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو گردن دکھنے لگتی ہے لیکن گردن کی اس ورزش سے دل و دماغ میں جو فرحت بیز ہوائیں منتقل ہوتی ہیں، وہ اردو شاعری کا بہت بڑا انعام ہیں۔

یہ جملہ معترضہ خاصا طویل ہو گیا۔ اب آئیے اقبال کی اس طویل نظم کو مختصر اور آسان نثر میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

یہ نظم ڈرامے کی طرز پر لکھی گئی ہے، پردہ اٹھتا ہے تو ابلیس اپنے پانچوں مشیروں کے ساتھ محو گفتگو ہے۔ وہ ابلیسی نظام کے بارے میں فکر مند ہیں۔ ابلیس کہہ رہا ہے کہ یہ دنیا جو کلمہ، کن سے نہیں بلکہ عناصر کے میل یا تنافر سے وجود میں آئی ہے اب خدا اسے برباد کرنا چاہتا ہے لیکن میں اسے برباد نہیں ہونے دوں گا۔ جس نخل کی میں نے برسوں آبیاری کی ہے یعنی لوگوں کو ملوکیت، مذہب سے بیگانگی، فلسفہ، تقدیر اور سرمایہ داری کا جو درس دیا ہے وہ رائگاں کیسے ہو سکتا ہے، یہ ابلیسی نظام محکم رہے گا۔

پہلا مشیر ابلیس کی تائید کرتا ہے، کہتا ہے کہ اے آقا! آج عوام محکومیت کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ یہ ان کی فطرت کا جزو بن گئی ہے۔ ان کی نماز بے قیام ہے ان کے صوفی و ملا حریت کے بجائے ملوکیت کی تعلیم دیتے ہیں، فلسفہ و تصوف ان کی زندگی میں افیون کی طرح داخل اور جہد و عمل ان کی زندگی سے خارج ہو گئے ہیں۔ ہمیں ان کے حج و طواف سے بھی خوف نہیں آتا کہ یہ بھی ایک سالانہ رسم ہے اور اس کا جہاد سے کوئی سروکار نہیں۔

دوسرا مشیر ٹکڑا لگاتا ہے کہ تم نئے فتنوں سے باخبر نہیں معلوم ہوتے: یہ مغربی جمہوریت کا جو چرچا ہے اسے تم کیا کہو گے۔ یہ خیر ہے یا شر؟

پہلا مشیر جواب دیتا ہے مجھے سب خبر ہے۔ ملوکیت کی روح یہ ہے کہ مزدور کو اس کی محنت کا پھل نہ ملے اس کا کھیت پرایا ہو پہلے ایک شخص سلطانی کرتا تھا اب کئی لوگ مل کر سلطانی کرتے ہیں: اور کیا تو نے غور سے مغرب کے اس جمہوری نظام کو نہیں دیکھا۔ "چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر"

تیسرا مشیر ایک نئے خطرے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم مغرب کی جمہوریت سے نہیں ڈرتے لیکن اس جرمن یہودی یعنی کارل مارکس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو ہر چند نہ وہ کلیم ہے نہ مسیح لیکن اس کی نگاہ حقیقت کے پردے چاک کر دیتی ہے۔

اس بات کا جواب چوتھا مشیر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، ہمارے آقا نے اس کا توڑ بھی پیدا کیا ہے اگر اشتراکیت ملوکیت کے لیے خطرہ بن سکتی ہے تو اشتراکیت کا توڑ فاشزم ہے۔ سیزر اور مسولینی میں کیا فرق ہے رومۃ الکبریٰ اور فاشسٹ اٹلی ملوکیت کی تصویر ہی کے دو رخ ہیں۔

تیسرا مشیر کہتا ہے کہ میں تو مسولینی کے اس اقدام کی ستائش نہیں کرتا۔ اس لیے ناحق افرنگی سیاست دانوں سے جنگ لڑی اس لیے کہ دونوں ہی فریق ابلیسی نظام کے استحکام اور اس کی بقا میں منہمک ہیں۔

اب پانچواں مشیر کھڑا ہوتا ہے وہ ابلیس کی قصیدہ گوئی کے بعد تیسرے مشیر کے خیالات کا اعادہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے بھی اب مغربی سیاست دانوں پر کوئی بھروسہ نہیں رہا اس لیے کہ

اس حکیم مزدک کے بروز یعنی کارل مارکس نے ایک قلیل عرصے میں دنیا کا مزاج بدل دیا ہے اور ایک عام مزدور اب حکمرانوں اور زمینداروں کا ہمسر ہو رہا ہے اور اس ابلیسی نظام کو درہم برہم کرنے پر آمادہ ہے: اے میرے آقا یہ میرا فرض ہے کہ تجھے اس خطرے سے آگاہ کروں۔

اس مرحلے پر ابلیس تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور اپنے مشیروں سے خطاب کرتا ہے کہ یہ سارا جہان میرے تصرف میں ہے مجھے نہ موجودہ سیاستدانوں کا ڈر ہے نہ حکیم مزدک یا مارکس سے کوئی خوف کیوں کہ جو امتیازات خود فطرت نے قائم کئے ہوں وہ محض زر اور زمین کی تقسیم سے حل نہیں ہو سکتے، مجھے اگر خوف ہے تو صرف اسلام سے کیوں کہ یہی ابلیسی نظام کو جڑ سے اکھاڑ سکتا ہے:

ابلیس اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے میں اس امر سے واقف ہوں کہ مسلمان قرآن سے بیگانہ ہیں اور دیگر اقوام کی طرح سرمایہ داری کے غلام ہیں۔ ان کی روحانی قوت کمزور ہو گئی ہے لیکن قرآن تو زندہ ہے اور زندہ رہے گا، مجھے ڈر ہے کہ عصر حاضر کے تقاضے کہیں دیگر اقوام کو شرع پیغمبر سے روشناس نہ کر دیں: تا بہ کہ یہ غنیمت ہے کہ مسلمان جہاد سے غافل اور الہیات کی تاویلات میں الجھا ہوا ہے۔

ابلیس اپنی تقریر کے اختتامیہ میں اپنے مشیروں کو تاکید کرتا ہے کہ صرف اسلام سے ڈرو کیوں کہ اس امت میں وہ شرار آرزو اب بھی موجود ہے جو ابلیسیت کے نظام کو خاکستر کر سکتا ہے بہتر ہو کہ مسلمان، فلسفہ، غیر اسلامی تصوف اور ذات و صفات حق سے متعلق مسائل میں الجھا رہے نجات کے مسائل عاقبت کی فکر اور غلامی کی زنجیروں میں اس قدر الجھ جائے کہ نظام ابلیسیت کے لیے بے ضرر ہو کر رہ جائے:

اقبال کی نظم کی اس تشریحی نثر کے بعد اس نظم کا مرکزی خیال بہت واضح ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ ملوکیت مغربی جمہوریت، فاشزم غرض یہ کہ دنیا نے حکومت کے جتنے سانچے، قاعدے یا قانون بنائے ہیں وہ سب دراصل ابلیسیت کا پردہ ہیں۔ عالم انسانیت کے مسائل کا حل اشتراکیت میں تلاش کرنا بے سود ہے صرف شرع پیغمبری اس دنیا سے ابلیسیت کو نابود کر سکتی ہے، اور یہ جب ممکن ہے کہ مسلمان فلسفہ، غیر اسلامی تصوف اور الہیات کے مسائل کے اثر سے آزاد ہوں جس کے سبب ان میں مزاج خانقاہی پیدا ہو گیا ہے، وہ اس شرار آرزو کی حفاظت کریں جو ان کے سینوں میں عشق رسول کے چراغ روشن کر سکے۔

اقبال کی یہ نظم ۶۴ اشعار پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی نہایت مختصر ہے۔ اس طرح کہ اس نظم کے بیشتر اشعار بلکہ مصرعوں اور کہیں کہیں کسی مصرعے کے ایک ٹکڑے پر بڑی طویل گفتگو کی جا سکتی ہے۔ یہ نظم دل و دماغ میں جو محشرستان جگاتی ہے اسے کاغذ کے چند صفحوں پر

منتقل کرنا اور اس مختصر وقت میں بیان کرنا ایک مشکل کام ہے۔ چند باتیں میں کہہ چکا ہوں اور چند اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اس نظم میں ہمیں اقبال کے طرز اظہار میں ایک لطیف سا تضاد نظر آتا ہے۔ اکثر وہ نہایت حکیمانہ باتیں بڑے سادہ اور سہل انداز میں کہہ دیتے ہیں، ایک شفیق استاد کی طرح اور ساری بات ہماری سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے۔ گویا ابتدائی جماعت کا کوئی سبق ہو: مثال کے طور پر یہ اشعار۔

کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود میرو سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

الہیات کے مسائل کی تفصیل جو نظم کے آخر میں ہے، یا پھر ابلیس کا یہ کہنا کہ۔

جانتا ہے جس پہ روشن، باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں، اسلام ہے

(یہاں لفظ فتنہ اپنے معکوس معنی میں آیا ہے) تو ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال نہایت حکیمانہ اور فلسفیانہ افکار بڑی آسانی سے دلکش اور سہل لفظوں کے ذریعے ذہن نشین کر دیتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ان کی شاعری میں ابہام در آیا ہے۔ اس ابہام کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت میں اس کا سبب اقبال کا بے پناہ علم ہے۔ فلسفہ، تاریخ عالم اور سیاسیات کے کئی نکتے اور بیشتر واقعات جو ان کے چشم بینا کو صاف دکھائی دیتے ہیں ان کے لیے ہمیں کئی خوردبینوں اور دوربینوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مثلاً اس نظم میں ایک جگہ پر وہ کہتے ہیں۔

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آل سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

غور کریں تو اس ایک شعر تلے تاریخ کے ہزاروں اوراق دب گئے ہیں۔ رومۃ الکبریٰ

جس کی تاریخ زمانہ قبل مسیح سے ۷۶ ۴ تک پھیلی ہوئی ہے اور جس کی عظمت سیزر (۱۰۰ قبل مسیح تا ۴۴ ق م) اور پھر TRAJAN (جس کا دور حکومت ۹۸ تا ۱۱۷ تھا) کے عہد میں بام عروج پر پہنچی ۔ دیکھیے اقبال نے کس آسانی سے سیزر اور مسولینی (۱۸۸۳ تا ۱۹۴۵) اور رومۃ الکبریٰ اور فاشسٹ روم کا ذکر ایک جملے یا دو مصرعوں میں کر دیا ۔ ان کے لیے مسولینی کو آل سیزر کہنا بڑی آسان اور فطری بات ہے ۔ ان کا تاریخی شعور اکیس صدیوں کا زمانی بعد ایک معمولی جست طے کر لیتا ہے ۔

بات یہاں ختم نہیں ہوئی ۔ اس شعر کے فوراً بعد جو شعر آیا ہے وہ ابہام کی دوسری صورت پیش کرتا ہے ۔

کون بحر روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا
گاہ بالا چوں صنوبر ، گاہ نالہ چوں رباب

اس شعر کے پہلے مصرعے کا مطلب واضح ہے یعنی یہ ابلیسیت ہی کی روح ہے جو بحر روم کی موجوں سے لپٹی ہوئی ہے اسی لیے سیزر جو ملوکیت کی علامت ہے اور مسولینی فاشزم کی اسی سرزمین سے پیدا ہوئے ۔ لیکن دوسرے مصرع میں ۔ گاہ بالا چوں صنوبر " کیا اس طرف اشارہ ہے کہ لوگ سیزر کی پرستش کی حد تک عزت کرتے تھے اور وہ لاکھ قد آور سہی اور چاہے اس کا دور حکومت کتنا ہی خوشنما نظر آئے اس نے آخر کار ملوکیت ہی کو فروغ دیا ۔ مسولینی جس نے ۱۹۱۹ ء میں فاشزم کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۲۲ سے ۱۹۴۳ تک اٹلی پر حکمرانی کی ۔ اس مصرع کا یہ ٹکڑا " گاہ نالہ چوں رباب " کیا مسولینی کے بارے میں ہے ، مگر کیوں ؟ خیال رہے یہ نظم ۱۹۳۶ ء میں لکھی گئی جو پہلی اور دوسری جنگ عظم کا درمیانی وقفہ ہے تو کیا اقبال نے دوسری جنگ عظم کی آہٹیں سن لے تھیں: اس لیے رباب نالہ کش ہے ؟ یا یہ مسولینی اور ہٹلر کے انجام بد کی پیش گوئی ہے:

اس طرز کے ابہام کی اور بھی مثالیں ہیں ۔ جیسے یہ شعر

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب

اس شعر میں موضوع گفتگو کون ہے ؟ کیا تیسرا مشیر مسولینی کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ اس نے ۱۹۴۰ میں فرانس کی شکست میں حصہ لے کر یا ۴۱ ء میں امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر کے کچھ اچھا نہیں کیا ۔ ۴۳ ء میں مسولینی کے مخالفین نے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا کیا " عاقبت بینی سے مراد یہ واقعہ ہے ۔ یا یہاں موضوع سخن مارکس ہے کہ افرنگی سیاست کو بے حجاب کر کے اور ابلیسیت کو للکار کر وہ اپنی عاقبت خراب کر رہا ہے ۔ ابہام کی یہ صورت معنی کی کئی سطحوں کے

ایک ہی وقت میں منظر عام پر آنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی مثالیں ہر اچھی شاعری میں ملتی ہیں: لیکن پہلی صورت جو اقبال کے بے پناہ علم اور تاریخی شعور کے باعث وجود میں آئی ہے اقبال ہی سے مخصوص ہے:

اس نظم کی ایک اور خصوصیت اس کی ڈرامائی ساخت ہے ۔ کچھ اشارے اقبال نے دئے ہیں کچھ باتیں، ہم اپنی طرف سے جوڑ لیتے ہیں ۔ یوں لگتا ہے ایک ہال میں ابلیس اور اس کے مشیر بیٹھے ہیں ۔ جیسے کوئی پارلیمانی سیشن ہو ۔ ابلیس ایک اونچی جگہ پر بیٹھا ہے وہ اور اس کے مشیر سوچ رہے ہیں کہ کس طرح ابلیسی نظام کی حفاظت کی جائے ۔ اسے کیا خطرات لاحق ہیں ؟ اقبال کے ڈرامائی آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ سارے حقائق جن سے وہ اپنی قوم کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں ابلیس کی زبانی اس طرح شعر کے پیکر میں ادا کرتے ہیں کہ اثر دونا ہو جاتا ہے ۔ فرق بس یہ ہے اور جو قاری پر عیاں ہے کہ ابلیس جن باتوں سے خوف کھاتا ہے وہ ملت کے حق میں مژدہ جانفزا ہے اور ابلیس جن باتوں سے خوش ہوتا ہے وہ ہمارے حق میں زہر ہلاہل سے کم نہیں ۔ اس کی مثالیں بہت ہیں جنہیں میں طوالت کے خوف سے پیش نہیں کر رہا ہوں ۔

بعض مصرعے تمثیلی پیکروں کی صورت میں ابھرتے ہیں ۔ جیسے

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
یا ۔۔ توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب
اور یہ مصرع ۔ ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

اس نظم میں ڈرامائی آرٹ کے کچھ اور خوبصورت پیکر اس وقت ابھرتے ہیں جب ابلیس اپنی ابلیسیت کے اظہار میں یوں لاف زنی کرتا ہے:

کون کر سکتا ہے اس کی آتش سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوز دروں

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخل کہن کو سرنگوں

کارگاہ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو

پہلے شعر میں ابلیس کا یوں اپنا نام لینا، دوسرے شعر میں لفظ "ہماری" اور تیسرے شعر

میں یہ ٹکڑا" توڑ کر دیکھے تو "ابلیس کے تکبر کا نقشہ کاغذ پر اتار دیتے ہیں۔

اقبال کی دوسری نظموں کی طرح اس نظم میں خیالات اور جذبات کا بہی بہاؤ ہے جو کسی باڑھ پر آئی ہوئی ندی کی طرح آپ کو اپنی جڑوں سمیت بہالے جاتا ہے۔ اس کے کئی شعر بلکہ اشعار کی ٹکڑیاں طوفان کی طرح وادی جاں میں اتر جاتی ہیں اور آپ اس طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ اس کی بھی بہت مثالیں ہیں کہاں تک گناؤں۔ آپ خود ہی اس نظم کو چاہے کہیں سے پڑھ لیں۔

میں دو اشعار پر اکتفا کروں گا۔

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

اقبال کو زبان پر بے پناہ قدرت ہے۔ ان کی لفظیات میں بلاغت اور معنی کا ایک دفتر پنہاں ہے۔ چند تراکیب دیکھئے: نماز بے قیام، ساکنان عرش اعظم، دنیائے دوں، کلیم بے تجلی، مسیح بے صلیب، روح مزدک کا بروز۔ بے ید بیضا، پیران حرم کی آستیں، کہیں کہیں ان کے مصرعے نہایت پر شکوہ ہیں۔ جیسے

فتنہ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

یا یہ شعر

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو

جیسے میں نے پہلے عرض کیا یہ نظم ذہن و دل کے کئی بند دروازے کھولتی ہے۔ معنی کے کئی گوشوں تک میری رسائی نہ ہو سکی۔ وقت کی کمی اور میری کم مائگی کے باعث کئی باتیں تشنہ رہ گئیں۔ بہ ایں ہمہ شعر اقبال کی دلکشی کے سبب ہی سہی آپ نے مجھے اپنا قیمتی وقت دیا اور میری باتیں سنیں۔ میں آپ حضرات کا ممنون ہوں۔

ڈاکٹر یوسف آعظمی

اقبال کی شاعری کے ادبی اور فکری سرچشمے

اقبال ایک فلسفی، دانشور اور شاعر تھے۔ان کی ابتدائی شاعری پر گہرے رومانی اثرات ملتے ہیں۔ وہ دہلی مکتب فکر اور لکھنو مکتب فکر سے یکساں متاثر رہے ہیں۔ دہلی مکتب فکر کی خصوصیات میں جذبہ اور حسن خیال کو زیادہ اہمیت تھی جب کہ لکھنو مکتب فکر میں زبان، مزاح اور تغزل پر زور دیا جاتا تھا۔

اسکول میں طالب علمی کے دور میں ارشد گورگانی دہلی اسکول اور ناظم لکھنوی لکھنوی اسکول کے اثرات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ دونوں مکاتیب فکر سے اپنا رابطہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ بعد میں اقبال نے داغ کو جو اس وقت اہم شاعر تھے اور دہلی اسکول سے تعلق رکھتے تھے اصلاح کے لیے تخلیقات روانہ کیں۔ داغ کے اثرات سنہ ۱۹۰۵ء تک نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا پہلا دور ہے۔ تاہم اس دور میں مذہبی حسیت بھی اقبال کے ہاں آہستہ آہستہ ابھرتی نظر آتی ہے۔ محزن کے ادبی کلچر کے اثرات بھی اقبال پر نمایاں تھے۔ انہوں نے انگریزی نظموں سے تراجم کئے۔ ہمدردی، عشق و موت۔ رخصت اے بزم جہاں، ایک پہاڑ اور گلہری جیسی تخلیقات پیش کیں جو تراجم کی اہم مثالیں ہیں۔

تخلیقی زندگی پر اس عہد میں مشاعروں کے اثرات بھی واضح ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ صوفی لٹریچر اور وحدت الوجود کے اثرات بھی در آئے ہیں اس طرح اقبال نے مختلف مکاتیب فکر اور سرچشموں سے اپنی تخلیقی تازگی حاصل کی ہے۔

اقبال کا شعری سفر مختلف ناقدین اپنے اپنے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ابتدائی دور آغاز سے ۱۹۰۵ تک محیط ہے جب کہ دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ پر مشتمل ہے۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء یورپ سے واپسی تک چوتھا دور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۲ء تک ہے۔ اس کے بعد پانچواں دور ایک طرح سے دوبارہ انہیں مسلک تصوف سے مربوط کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں رومانیت اور کلاسیکیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ رومانی شعرا کی طرح وہ خلوص اور تڑپ کو شاعری میں اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں کلاسیکیت زبان، سانچوں کو برتنے میں نظر آئے گی۔ علائم بھی ان کی شاعری میں بڑی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ یس اے واحد نے اردو، فارسی شعری روایتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس جانب توجہ مبذول کروائی کہ اقبال کے ہاں رومانیت، کلاسیکیت کے ساتھ سمبلزم کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ اس کے برخلاف بعض نقاد

بشمول شمس الرحمن فاروقی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں علامتوں کا استعمال نہیں ہے بلکہ اکہرے پن کی وجہ سے انہیں علامتیں قرار نہیں دے سکتے ۔ ہارڈنگ کے حوالے سے وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں لیکن صرف ایک لفظ لالہ کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال کبھی تنہائی کبھی تہذیب اور کبھی اسلامی ورثہ کے سیاق سباق میں جس طرح نظر آتا ہے، ہم اس کی علامتی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے ۔

اردو ، فارسی کی شعری روایات اور شاعروں نے اقبال کے شعری سفر میں اہم رول ادا کیا اقبال کی فکر داغ کے شعری رویوں میں اسیر نہیں ہو سکتی تھی ۔ اقبال سے پہلے اردو شاعری کے دو بڑے نام میر اور غالب کی عظمت سے انکار ممکن نہیں ۔ تاہم اقبال کی فکر کے لیے غالب ایک آئیڈیل ہے ۔ غالب کی شاعری فکر اور جذبہ کا ایک خوبصورت امتزاج ہے ۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ گیرائی اور نفسیاتی گہرائی کے پرتو ہیں ۔ زندگی ، ذوق ، شوق ، شرارہ ، آہو ، محبت ، انا ، شوخی ، عجب نہیں کہ غالب کے ہاں سے در آئی ہو ۔ دونوں شاعروں کی شناخت اس طرح دیکھی جا سکتی ہے کہ غالب نے اپنے آپ کو عندلیب گلشن نا آفریدہ کہا ہے جب کہ اقبال نے من فردا سے اپنی بات منوائی ہے ۔ غالب اور اقبال کے ہاں تصوف کا رنگ ملتا ہے ۔ وجودی تشویش ، انسان دوستی کی مثالیں ہیں ۔ دونوں نے سبک ہندی میں لکھا اور انسانی آزادی کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا ہے غالب اور اقبال کے درمیان فرق بھی ملتا ہے ۔ اقبال یقین پر زور دیتے ہیں اور تشکیک کم ہے ۔ جب کہ غالب کے ہاں تشکیک ایک اہم حصہ ہے ۔ اقبال نے غالب کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے ۔

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں
(مرزا غالب ۔ بانگ درا)

اقبال خوش قسمت تھے کہ انہیں میر حسن ۔ آرنلڈ اور براون کی رہنمائی حاصل رہی ۔ شبلی کی شخصیت کا نکھار بھی ان کی تحریروں میں ملے گا ۔ علم کی اشاعت میں شبلی نے ان کی مدد کی تھی ۔ شبلی نے عصری حالات ، تاریخ اور اسلامی واقعات کو شاعری کا حصہ بنایا ۔ اقبال کے ہاں یہ روایات طاقت بیان سے ملی ۔ ایثار ، صدق ، ہمدردی ، مان اور بچہ ۔ ایک مکڑا اور مکڑی ، ایک گائے اور بکری اس کی مثالیں ہیں جہاں واقعہ اور بیانیہ اظہار کی مثالیں ملتی ہیں ۔

شبلی کے ہم عمر خواجہ الطاف حسین حالی ، غالب کے شاگرد تھے ۔ مدو جزر اسلام (مسد حالی) کے ذریعے زبردست مقبولیت حاصل کی ۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے المناک حالات مغلیہ سلطنت کی

شام، برطانوی سامراج کے مظالم کی داستانیں سنائیں۔ مسدس نے مسلم کمیونٹی کے شعور کو بیدار کیا۔ شکوہ اور جواب شکوہ پر مسدس کی پرچھائیاں نظر آئیں گی۔ حالی نے دردناک حالات کی تصویر کھینچی مگر وہ اقبال کی طرح شاعر فردانہ تھے۔ حالی نے شاعری میں اصلاح کی کوشش کی۔ اس طرح مقدمہ شعر و شاعری کا پہلا مینی فیسٹو ہے۔ اخلاقی نقطہ نظر کے ذریعہ انہوں نے شاعری میں پیغام دیا جب کہ اقبال کے ہاں کھوئے ہوؤں کی جستجو کے ساتھ فردا پر نظر ہے۔

اقبال کی شاعری پر اکبر الہ آبادی کا رنگ بھی ایک دور میں نمایاں ملتا ہے۔ اقبال کا ظریفانہ کلام اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اکبر مغربی تہذیب کے خلاف ہے۔ خاص طور سے دہریت کے امکان کی وجہ اقبال بھی اس نقطہ نظر کے حامی تھے۔ دونوں کے درمیاں ایک فرق ملتا ہے۔ اقبال مغرب کی سفاکیت کے علاوہ اس کے فعال روپ کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ ایک نئی مشرقیت کے حامی ہیں۔

اقبال کی فارسی شاعری نے کئی سرچشموں سے اکتساب کیا۔ فارسی شعری روایت سے ان کی گہری واقفیت ان کے شعری سفر میں معاون رہی۔ اردو فارسی روایت کا ایک دوسرے سے بہت قریبی ربط رہا ہے۔ فارسی شعرا کی کہکشاں فردوس، انوری، سعدی، حافظ، نظامی، امیر خسرو بیدی، جامی، خاقانی، عرفی، عطار، غالب اور غنی کاشمیری ہیں مگر ان کی شاعری میں مرکزی اثر جلال الدین رومی کا ہے۔ خودی کی مرکزیت، صوفیانہ مسلک سے وابستگی، عقل اور وجدان کے درمیان کشمکش، جلال الدین رومی کی شاعری سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے۔ انامیری شمل نے The triumphal sun میں کہا ہے کہ اقبال نے مولانا روم سے مکمل اکتساب نہیں کیا، ان کے ایک گوشہ کی کرنیں اقبال کے کلام میں ملتی ہیں۔ اسرار خودی میں، ہم فارسی روایات کو بدرجہ اتم دیکھ سکتے ہیں جہاں مولانا روم کے علاوہ نظیری کی جستجو بھی اقبال کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہے۔

اقبال اور حافظ کے ذہنی رشتے بڑے عجیب ہیں۔ اسرار خودی میں انہوں نے حافظ پر شدید تنقید کی ہے لیکن یہ تنقید ادبی اصولوں کے بجائے سماجی، سیاسی حالات کے پیش نظر زیادہ معنویت رکھتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال نے یہ اعتراف کیا: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حافظ کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے۔ امیجس، استعارے، شعری ارتکاز میں وہ حافظ سے بہت قریب ہیں۔ حافظ کے علاوہ عبدالقادر بیدل سے بھی وہ غیر معمولی متاثر رہے ہیں۔ انہوں نے بیدل کو مرشد کامل کہا ایک وقت کچھ نوجوان اقبال کے ہاں حاضر ہو کر ان سے یوم اقبال منانے کی بات کرنے لگے تو اقبال نے تلقین کی کہ مرشد کامل بیدل کا یوم منایا جائے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اقبال کس طرح بیدل کو اہم شاعر تصور کرتے تھے۔ اردو کے دو اہم شعرا غالب اور اقبال پر بیدل

کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔

فارسی شاعری سے تو اقبال نے کافی اکتساب کیا لیکن عربی شاعری سے بھی ان کے اکتساب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حجازی لئے اور عربی کلاسیکیت ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ مسجد قرطبہ کو عربی شاعری میں بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ کئی عربی شعرا نے اس کو اپنی اپنی تخلیقی توانائی کا حصہ بنایا۔ اقبال نے ایک وسیع کینویس پر اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ جاوید نامہ میں طواسین بھی عربی روایت کا تسلسل ہیں۔

عربی اور فارسی روایات کے علاوہ پنجاب کی اس سرزمین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کے خمیر سے اقبال کی زندگی گوندھی ہوئی تھی۔ ظاہر پرستی کے خلاف بھرپور آواز دراصل پنجابی شاعری کی دین ہے۔ اس کے علاوہ تصوف سے کشش اور گریز کی مثالیں یہاں کے ماحول ہی کی عطا ہیں۔ پنجابی کلچر کا اردو سے گہرا ربط رہا ہے۔ اقبال کی شاعری میں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

انگریزی شاعری خاص طور سے رومانیت سے اقبال نے اپنے آپ کو بہت قریب پایا ہے انہوں نے Stray reflections (بکھرے خیالات) میں اس بات کا اعتراف کیا کہ ورڈز ورتھ کی شاعری نے انہیں دہریت سے بچانے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ورڈس ورتھ کی شاعری میں عیسائی شعور اور اخلاقیات کی جھلکیاں ملتی ہیں جب کہ اقبال کی شاعری میں اسلامی مابعد الطبیعات کے عناصر ہیں۔ دونوں شاعروں نے صنعتی عہد کی دردناک جبریت کا شکار ہونے والے سماج پر تنقید کی ہے۔

اقبال نے ایک حوالے سے یہ بات کہی۔۔۔ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات تاہم ان کے درمیان فرق ہے۔ ورڈس ورتھ نے شاعری کو جذبوں کا بے ساختہ بہاؤ قرار دیا جب کہ اقبال شاعری کو زندگی اور شخصیت کے تابع محسوس کرتے ہیں۔ انفس اور آفاق کے درمیان گہرے ربط کو اہمیت دیتے ہیں۔ فطرت کی فعالیت جیسے بہتے چشمے، کوہساروں کی عظمت ان کے ہاں زیادہ نمایاں ہے۔ اقبال کی رومانیت فطرت میں اپنی شناخت گم نہیں کرتی۔ انگریزی کے ایک اور اہم شاعر ملٹن کے ہاں خیر و شر کا مسئلہ بہت اہم ہے۔

ملٹن کے ہاں ابلیس کا امیج اور اقبال کی شاعری میں اس طرح کی مماثلتیں ملتی ہیں۔ اقبال برو ننگ سے بھی متاثر تھے۔ بکھرے خیالات اس بات کی شہادت دیتے ہیں۔

مشرقی اور مغربی ماخذ کو اقبال نے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ جرمن فکر سے ان کا گہرا تعلق تھا، کانٹ، ہیگل، نیٹشے، فکری سطح پر کسی نہ کسی سطح پر ان کے ہاں نظر آئیں گے۔ پیام مشرق، گوئٹے کے جواب میں لکھی گئی۔ گوئٹے حافظ سے غیر معمولی متاثر رہے ہیں، ایماویکے ناست کے نام لکھے ہوئے خطوط میں گوئٹے کا ذکر ملتا ہے۔ جاوید نامہ میں غالب اور گوئٹے کا ایک تقابلی ذکر بھی

ملتا ہے ۔ گوئٹے اور اقبال دونوں کے ہاں رومانیت کلاسیکیت کے ساتھ ایک فعالیت بھی ہے ۔ انامیری شمل نے پیام مشرق اور جاوید نامہ پر ان کے اثرات کی نشاندہی کی ہے ۔

جاوید نامہ اور ڈیوائن کامیڈی میں مماثلت ملتی ہے ۔ تاہم ڈانٹے اقبال کے لیے سرچشمہ تحریک نہیں تھے ، بلکہ ان کی حیثیت ایک stimulant کی سی تھی ۔ ڈیوائن کامیڈی ، خالص عیسائی پس منظر میں لکھی گئی ہے اور جاوید نامہ مابعد الطبیعاتی تاریخی اور تہذیبی پس منظر آسین کی تحقیق کے مطابق معراج کے واقعات اور فتوحات مکیہ سے ڈانٹے اور دوسروں نے اکتساب کیا ۔ جاوید نامہ معراج کے واقعات کے پس منظر میں مناسب اہمیت رکھتا ہے ۔

اقبال نے ایک تخلیقی فن کار کی طرح مختلف روایتوں سے اکتساب کیا ۔ یہ اکتساب ادبی اور فکری سرچشموں اور عالمی ادب کی عظیم فن کارانہ شخصیتوں سے مربوط ہے ۔ ماخذ مختلف ہیں لیکن اقبال ایک حسین شاعر کی حیثیت سے اس طرح اپنی شعری شخصیت اور سرمایہ کا حصہ بنایا کہ ان کی تخلیقی آنچ وژن میں سمو گئے ہیں ۔

ان کے ہاں کئی روایتوں کی کئی لہریں مل کر ایک دائرہ بناتی ہیں مگر اس روایت میں ان کی انفرادیت شعری دنیا کو نئے سفر سے روشناس کراتی ہے ۔ اس طرح روایت ان کی آفاقیت کی اشاریہ ہے اور انفرادیت ، ان کی شخصیت کا جیتا جاگتا پیکر ۔

شاعر جمالیات کو اقبال کے شعری نظام میں بڑی اہمیت ہے ۔

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمہ خسرو
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمہ جبریل ہے یا بانگ سرافیل
خون رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانہ حافظ ہو کہ بت خانہ بہزاد

اقبال دنیا کے چند عظیم شاعروں کی صف میں نظر آئیں گے ۔ اقبال کی شاعری ہمارے ذہن ، جذبوں اور شعور کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی ہے ۔ عصر حاضر کی تاریخ میں فکر و فن کے ذریعہ ایسا دیرپا گہرا اور وسیع تر اثر مرتب کرنے والی شخصیتیں کم کم ہی ملیں گی ۔

ہم اقبال کو خالص مغربی یا خالص مشرقی پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے ۔ مغربی تنقیدی زاویوں کو جب ہم مشرقی سانچوں پر منطبق کرتے ہیں تو جہاں تحسین اور تفہیم کے نئے امکانات سامنے آتے ہیں وہاں ایک خطرہ درپیش رہتا ہے کہ بہت سے گوشے جو ان زاویوں سے وسیع تر

احاطے پر محیط ہوتے ہیں، پہنچ سے دور رہ جاتے ہیں اس لیے شاعری اور ادب کی تنقید میں مختلف اصناف کی خصوصیت اور تہذیبی فضا کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اقبال کی شعری کائنات کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے مگر یہ عصری دنیا کے تناؤ کو اپنے وجود میں سمیٹ کر صبح فردا کی طرف گامزن ہے۔

دلیل کم نظری قصہ قدیم و جدید

شاعر رنگین نوا دیدہ بینائے قوم ہے۔ اقبال نے جو بات اپنی نظم شاعر میں کہی ہے اس کے آئینے میں خود ان کی شخصیت کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری ہے۔ کلام میں شان خلیل کی جھلک ہے۔ ان کی شاعری سے اہل زمین کو زندگی دوام کا نسخہ ہاتھ آتا ہے کیوں کہ یہ وہ سخنوری ہے جو درد انگیز نالوں میں ڈھلی ہے کیوں کہ خون جگر سے اس کی تربیت ہوئی ہے۔ اقبال کی شعری کائنات تصویر درد ہے۔ آئینہ دل فضا کے رازدانوں میں ہے۔ شاعر وہ پیغمبرانہ وصف رکھتا ہے کہ بام عرش کے طائر اس کے ہم زبانوں میں ہیں۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

اقبال نے تنقید کے اس سحر کو توڑا کہ مذہبی حیثیت کی شاعری بڑی شاعری نہیں ہوتی۔ مطالعہ اقبال الگ الگ خانوں میں ممکن نہیں ہے۔ شاعر اقبال اور دانش ور اقبال کے درمیان فصل نہیں ہے بلکہ ایک تخلیقی اور نامیاتی وحدت ہے۔ ایک ہی جہتی تنقید شعر اقبال کی تفہیم اور تعبیر کا حق ادا کر سکتی ہے۔

انتخاب اقبالیات

ابراہیم جلیس

اقبال

ڈسمبر ۱۹۴۲ء کی ایک شام بادشاہی مسجد لاہور کے پہلو میں، میں نے سنگین چبوترہ نما ایک قبر دیکھی۔ میرے ساتھیوں نے کہا۔۔۔ یہاں اقبال ابدی نیند سو رہا ہے۔ یہ بات بجائے خود صحیح ہو تو ہو میں اسکی صحت پر شبہہ کرتا ہوں اقبال کی قبر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود میں ہر لمحہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ اقبال نہ تو مرسکا اور نہ اقبال سو رہا ہے اقبال تو آج بھی زندہ ہے۔ اقبال تو آج بھی وجاگ رہا ہے۔ اور میں کہنے پر مجبور ہوں کہ

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہہ خاک نہیں ہے

اقبال ایک بالائے خاک ہستی ہے۔ اقبال ایک زندہ جاوید ہستی ہے۔ اور آج ہم اس کی حیات جاودان کی سالگرہ منانے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ بظاہر تو اقبال کا جسم ہمیں یہاں نظر نہیں آتا مگر کیا ہم اقبال کے اس وجود سے نظریں ہٹا سکتے ہیں جو آج اس وقت بھی ہمارے شبستان وجود کو اپنی نوائے جگر گداخت کا سوز عطا کر رہا ہے۔۔؟

اقبال کی جب وفات ہو گئی تو اس وقت سارا ہندوستان رونے لگا کہ اب دوسرا اقبال کبھی نہ پیدا ہوگا۔ مگر میں پوچھوں کہ دنیا کو دوسرے اقبال کی ضرورت ہی کیا ہے جب کہ اقبال ایک کبھی نہ مرنے اور کبھی نہ فنا ہونے والی ہستی ہے ۔۔۔۔ جاوید منزل میور روڈ لاہور میں رہنے والا اقبال تو مر سکتا ہے مگر وہ اقبال جو پیام مشرق کا ہے۔ اسرار رموز ہے۔ "زبور عجم" ہے "ارمغان حجاز" ہے "بال جبرئیل" ہے "بانگ درا" ہے ۔۔۔۔ وہ اقبال کبھی مر سکتا ہے؟ اس اقبال کا سورج کبھی غروب بھی ہو سکتا ہے۔۔۔؟

اقبال کون تھا۔۔۔؟ اقبال کے بارے میں بڑی متضاد رائیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اقبال ایک شاعر تھا۔ کسی کا خیال ہے کہ اقبال ایک فلسفی تھا اور کوئی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اقبال ایک پیغمبر نہ تھا۔ مگر اقبال نہ تو ایک پیغمبر تھا شاعر اور نہ فلسفی ۔۔۔۔۔ بلکہ وہ تو صرف ایک "مرد خود آگاہ" تھا۔

اقبال کا صحیح تعارف صرف یہی ہو سکتا ہے۔

یوں تو اردو اور فارسی ادب میں اقبال کا نام ہمیں شاعروں کی صف میں نظر آتا ہے مگر

اقبال کو شاید خود اپنے شاعر ہونے میں تامل تھا۔ چنانچہ فارسی ادب کے نقادوں سے وہ یوں خطاب کرتا ہے کہ

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ است
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

اس طرح اردو ادب کے ناقدین سے یوں مخاطب ہے کہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

ایک اور جگہ وہ کہتا ہے۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری مری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اقبال کی طرح مجھے بھی اقبال کو ایک شاعر ماننے میں تامل ہے کیوں کہ اقبال کا مقام ایک شاعر کے مقام سے کہیں زیادہ بلند ہے یا پھر اگر اقبال واقعی ایک شاعر تھا تو میں بلا خوف ابطال یہ کہتا ہوں کہ شاعری اقبال پر ختم ہو گئی۔

اقبال کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ہندوستان کی منظوم سیاسی تاریخ پڑھ رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی تاریخ میں بادشاہوں، حکومتوں اور لڑائیوں کے تذکرے پڑھنے کے بعد اقبال کے کلام کا مطالعہ بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ پھر ہندوستانی تاریخ نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہماری سیاسی تاریخ میں اس کا تو ذکر ہے کہ ماضی میں کیا کچھ ہوا مگر اس کا کوئی ذکر نہیں کہ مستقبل کیا ہو گا۔۔۔۔؟ یہ ذکر ہمیں، اقبال کے کلام میں ملتا ہے اور اسی لیے میں اقبال کو ہندوستانی تاریخ کے مستقبل کا مورخ سمجھتا ہوں۔ مستقبل کی تاریخ کی تدوین کے لیے اقبال کا کلام ایک خاکہ ہے۔ چنانچہ ثبوت کی خاطر میں یہ عرض کروں گا کہ اقبال کے کلام میں ہمیں وہ پاکستان نظر آتا ہے جو آج ایک جغرافیائی حقیقت اختیار کر چکا ہے۔

آج پاکستان کی سرزمین کو اس اعزاز پر بڑا ناز ہے کہ اقبال کا مزار پاکستان میں ہے مگر اقبال نہ تو پاکستانی تھا اور نہ ہندوستانی۔۔۔۔۔ اقبال نہ تو ایشیا کی ملک ہے اور نہ مشرق کی بلکہ اقبال ساری کائنات کی ملک ہے۔ اقبال ایک آفاقی شاعر ہے۔ اقبال کو شاعر مشرق یا شاعر ملت کہنا بہت بڑی غلطی ہے کیوں کہ اقبال شاعر انسانیت ہے۔

اقبال کے شعر جب پہلی بار سرزمین ہمالہ کی فضاؤں میں گونجے، اس وقت ہندوستان نے بڑی شکوک کی نظروں سے اقبال کو دیکھا۔ لاہور کا وہ مشاعرہ جس کے صدر مرزا ارشد گرگانی

تھے اور جس مشاعرے میں اقبال نے پہلی بار شرکت کی تھی ۔ اسی مشاعرے سے اقبال کی شاعری کے آفاقی نظریہ کا پتہ چلتا ہے ۔ اقبال نے اس مشاعرے میں اپنی نظم کا آخری شعر پڑھا تھا

ہم کو تو نہ لکھنو سے نہ دلی سے ہے غرض
اقبال ہم اسیر میں زلف کمال کے

اقبال کی پہلی پبلک نظم کے اس آخری شعر سے اقبال کی آفاقی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد جب اقبال کا یہ شعر فضا میں بلند ہوا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تو اس وقت سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی ۔ ہر طرف سے اقبال پر طرح لے دے ہونے لگی ۔ وہ دور ہندوستان میں قومیت کا دور کہا جاتا تھا اس لیے اقبال کے اس ترانہ ملی کو فرقہ وارانہ ذہنیت کا آفریدہ سمجھا جاتا رہا ۔ اور اقبال کو وطن دشمن قرار دیا گیا ۔ عام اعتراضات سے قطع نظر خود مولانا محمد علی جوہر نے ترانہ ملی پر ۱۹ اگست ۱۹۲۷ء کے اخبار ہمدرد میں ایک اداریہ لکھا کہ

"چین انگریزوں کا ہے یا امریکیوں کا جاپانیوں کا یا پھر چینیوں کا جن میں مسلمانوں کا اچھا خاصہ عنصر ہے ۔ لیکن یقیناً ہمارا تو آج نہیں ہے ۔۔۔ اور عرب انگریزوں کا ہے یا فرانسیوں یا یہودیوں کا لیکن جہاں حضرت خدیجہؓ کا مکاں شہید کر دیا جائے اور اس میں بول و براز کیا جائے اور جب اس کی شکایت کی جائے تو اقبال کے ہم وطن بھائی مسٹر اسماعیل غزنوی ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی سے فرمائیں کہ کیا خدیجہ خود وہاں بول و براز نہیں کرتی تھیں ، جہاں مولا رسول اللہ کو بھی شہید کر دیا جائے اور جہاں امہات المومنین اور اہل بیت کی قبروں کے نشان تک نہ چھوڑے جائیں جہاں کی مسجد تک شہید کر دی جائے اور ہم اس کے لیے کچھ نہ کر سکیں ۔ وہ عرب ہمارا نہیں ہے ۔"

مولانا محمد علی کے علاوہ ایک اور نقاد کا یہ اعتراض قابل توجہ ہے وہ کہتا ہے ۔

"اقبال کا نظریہ زندگی لاجواب ہے ۔ لیکن ان کا نظریہ ملت بہت غلط اور ضرر رساں ہے ۔ وہ جن بلندیوں پر انسان کو لیجانا چاہتے تھے ۔ وہاں مسلمان اور غیر مسلمان سبھی کو پہنچنا ہے اور بغیر مذہب کے پہنچنا ہے ۔"

اس نقاد کے ساتھ ہمیں ایک شاعر بھی نظر آتا ہے جس نے اقبال کو ایک فرقہ پرست شاعر قرار دیکر ایک نظم بھی کہی تھی جس کے ذریعہ علامہ اقبال سے خطاب کیا تھا ۔ چند شعر یہ ہیں ۔

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے جانتا ہوں

مگر ہے گنگا کی سرزمین سے سلوک تیرا مخاصمانہ
اسی نے پالا اسی نے پوسا اسی نے بخشی تجھے جوانی
وطن امیر و غلام تیرا کلام ہے بے پیام تیرا
گرہ غلامی کی کون کھولے تری خموشی ہے مجرمانہ
تو فخر ہندوستان نہیں ہے تو شاعر ایشیا نہیں ہے
تو فرقہ پرور ہے فتنہ زا ہے برنگ اعجاز شاعرانہ

نہیں معلوم ان اعتراضات کا اقبال پر کیا اثر مرتب ہوا تھا اور اس نے کوئی جواب دیا تھا یا نہیں .... مگر جہاں تک فرقہ واریت کا الزام ہے وہ اس لیے جھوٹا ہے کہ اقبال کی نظر میں اسلام مسلمانوں کا مذہب نہیں بلکہ انسانیت کا مذہب ہے اس لحاظ سے اقبال کو محض اسلامی شاعر سمجھنا تنگ نظری ہے یہ نہ صرف میرا خیال ہے بلکہ اکثر باشعور غیر مسلم اصحاب کا بھی ہے ۔ چنانچہ یہاں میں سر تیج بہادر سپرو کی وہ رائے پیش کرتا ہوں جو انھوں نے مولوی عبد الحق کو رسالہ اردو کے اقبال نمبر کی ترتیب کے موقع پر لکھ بھیجی تھی ۔ سر تیج بہادر سپرو نے فرمایا ہے کہ •••

"اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ محض اسلامی شاعر تھا ۔ یہ کہنا اس کے دائرہ اثر کو محدود کرنا ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے فلسفہ اسلامی، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ۔ لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا یا کالی داس کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا اس کے اثر کو محدود نہیں کیا ۔ اور نہ دوسرے مذہب کے آدمیوں نے اس وجہ سے اس کی قدر دانی میں کمی کی ۔ اگر اقبال اسلامی تاریخ کے بڑے کارناموں کے بارے میں یا اسلامی عظمت کا تذکرہ کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم اس کی قدر نہ کریں ۔"

سر تیج بہادر سپرو کا یہ جواب اقبال پر فرقہ وارایت کے الزام کی زوردار نفی کرتا ہے مگر جہاں تک اقبال کی وطن دشمنی کے الزام کا تعلق ہے وہ اس لیے غلط ہے کہ اقبال ہندوستانی نہیں تھا بلکہ اقبال ایک عالمگیر شخصیت تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اسے ہندوستان سے محبت نہیں تھی ۔ اسے ہندوستان سے عشق تھا اور افلاطونی قسم کا عشق تھا ۔ وہ صرف وطنیت کے تصور کے خلاف تھا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ •••

"ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے"

اقبال جو خدائے واحد کا عبادت گزار تھا وہ ان ارضی خداؤں کی بندگی کیسے گوارا کر لیتا ۔ وہ رنگ و

نسل اور جغرافیائی تقسیم کا بہت بڑا مخالف تھا۔ اس کے سامنے انسان صرف انسان تھا۔

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اقبال ہندوستانی اور غیر ہندوستانی کے امتیاز کو بالکلیہ ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے پہلی نظر میں اقبال غیر ہندوستانی نظر آتا ہے جو لاہور میں بیٹھ کر فلسطین اور قرطبہ، نجد و حجاز کے قصیدے پڑھتا ہے اقبال کو صرف اس ہندوستان سے نفرت تھی جو ایک غلام ہے اس نے خدا سے بھی یہ شکوہ کیا تھا کہ اس دیس میں مجھ کو پیدا کیا جس دیس کے بندے غلامی پر رضامند ہیں۔ ایک بار اور کوئٹے سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے اسی افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ۔

او چمن زادے چمن پر وردہ
من و میدن از زمین مردہ

بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ جب اقبال نے یورپ اور بلاد اسلامیہ کا سفر کیا تو اس کی رہی سہی ہندوستانیت بھی ختم ہو گئی۔

اقبال کا سفر یورپ اس کی شاعری کا تجرباتی دور ہے ۱۹۰۵ء میں اقبال سفر یورپ کرتے ہیں اور اس فرنگی گر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جس نے ساری دنیا کو خمار خانہ بنا رکھا ہے۔ اقبال کی شاعری میں فرنگی کی وہی اہمیت حاصل ہے جو اردو کی عشقیہ شاعری میں جناب شیخ جی کو حاصل رہی ہے۔ اقبال موجودہ انسانی زندگی کے ہر آزاد کو ہر لعنت کو، ہر نحوست کو فرنگی کی شر پسند ذہنیت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کر فرنگی تہذیب نے اپنا پروپگنڈہ کچھ ایسے سلیقہ سے کیا ہے کہ ایک عامی کی عقل دہو کا کھا جاتی ہے کہ دنیا نے یا انسان نے ترقی کی معراج دیکھ لی ہے۔ خوبصورت شہروں، جگمگاتی دوکانوں، اونچے اونچے مکانوں، رنگ برنگے لباسوں کو دیکھ کر انسان کی پہلی نظر یقیناً خیرہ ہو جاتی ہے۔ مگر اقبال نے یورپ میں قدم رکھنے کے بعد فرنگی کی شیشہ گری کو سمجھنے کے بعد اپنے آپ کو سمجھایا۔

گرچہ ہے بہت دلکشا حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند و بال دانہ ، دام سے گذر

ہندوستان کی جدید معاشرت میں یورپ کا سفر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ عام ہندوستانی جب یورپ جاتے ہیں اور یورپ سے واپس آتے ہیں تو اپنا بڑا دلچسپ اور رنگین سفر نامہ لکھتے ہیں، سناتے ہیں۔ یورپ کی عمارتوں جھیلوں تالابوں اور عورتوں کی تصویریں بطور یادگار اپنے ساتھ لاتے ہیں گفتگو میں بار بار یورپ کی تہذیب، یورپ کی سیاست، یورپ کی معاشرت کا حوالہ دیتے ہیں اور بڑا فخر محسوس کرتے ہیں مگر اقبال کچھ عجیب رجعت پسند تھے انھوں نے کوئی رنگین سفر نامہ

نہیں لکھا انھوں نے برف کے کسی گلیشر پر کھڑے ہو کر تصویر نہیں کھنچوائی، کسی لعبت فرنگی کے ساتھ رقص نہیں کیا نہ بجلی کے چراغوں کی براقی سے ان کی آنکھیں چندھیائیں ---- عام ہندوستانیوں کو یورپ چھوڑتے ہوئے رنج ہوتا ہے، مگر اقبال تو بہت جلد یورپ سے اکتا گئے تھے چنانچہ ایک بار انھوں نے اپنے وحشت دل کا اس طرح اظہار کیا کہ •••

فرنگ میں کوئی دن اور ہی ٹھیر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

قیام یورپ میں اقبال نے جدید سیاسی تحریکات کا بغور مطالعہ کیا، بالخصوص جمہوریت کا جس کا دعویٰ ہے کہ وہی ایک انسانیت کی فلاح و بقا کا تنہا پیغامبر ہے۔ لیکن، جمہوریت کے چہرے کا زر تار انچل سرکا کر جب انھوں نے جمہوریت کے اصلی خد و خال دیکھے تو کہہ بغیر نہ رہ سکے کہ •••

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیراز نوائے
دیو استبداد جمہوری قباء میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خوب آوری
گرمئ گفتار اعضائے مجالس الامان
یہ بھی ایک سرمایہ دارونکی ہے جنگ زر گری
اس سراب رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو
آہ اے نادان قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

یہودیت کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو یقیناً آپ کو بھی اقبال کا ہمنوا ہونا پڑے گا۔ دنیا میں آج تک صحیح جمہوریت کبھی قائم نہ ہو سکی۔ جو جمہوریت ہے وہ سرمایہ داری کے بطن سے پیدا ہوئی ہے اور سرمایہ داری استبدادیت کا دوسرا نام ہے۔

جمہوری حکومت میں، ہمیشہ اور کم پڑھا لکھا طبقہ برسر اقتدار آتا ہے جس کے نتائج دیکھکر اقبال نے کہا •••

گریز از طرز جمہوری غلامے پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

موجودہ جمہوریت جو تہذیب، ثقافت، تعلیم اور تمدن معرض وجود میں لاتی ہے وہ نہایت ادنیٰ اور ناقص درجے کی ہوتی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ مغز دو صد خر ہے۔ اقبال نے جمہوریت کی

بڑی اچھی تعریف کی ہے۔

اس راز کو ایک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ایک اور جگہ اقبال نے مسولینی کی نطق سے جمہوریت کا پول کھولا ہے۔•••

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کم زور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آل سیزر چوب نے کی آب یاری میں رہے
تم نے تو دنیائے بنجر بھی نہ چھوڑے بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

ملوکیت، شہنشایت، آمریت یہ سب سرمایے کے نشے ہیں اور نشے کے لیے اقبال یہ ترشی تجویز کرتا ہے۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انسان کی قباچاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں بستہ قوت ہے خطرناک

سرمایہ داری جمہوریت کی آڑ لے کر جس زبوں مساوات کا پرچار کرتی ہے اس پر اقبال یوں طنز فرماتا ہے۔

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

شاید اسی انسانی خون شام سیاست سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے اور خدا سے عرض کرتا ہے•••

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست

باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

جمہوریت ملوکیت، شہنشاہیت، آمریت اور، ہر قسم کے نظام حکومت پر اقبال نے یوں تو بہت کچھ کہا ہے۔ جن میں اقبال نے ان سیاسی نظامات کے اصلی خط و خیال بے نقاب کیے ہیں۔

آبتاؤں تجھ کو رمز آسیہ ، ان الملوک
سلطنت اقواام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلادیتی ہے اس کو حکمران کی ساحری

اسی لیے اقبال ان تمام سیاسی تحریکات سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اب وہ گویا قید مکان سے بھی آزاد ہو کر ایک آفاقی شاعر ہو جاتا ہے۔ وہی اقبال جو ترانہ ہندی گاتا تھا، وطنیت کی بدصورتی دیکھ کر اپنے پچھلے عقیدہ وطنیت کو بوں باطل کرتا ہے۔

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمر قند

مشینی تہذیب میں یورپ کو مسموم ہوتا ہوا دیکھ کر وہ کہتا ہے۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

اسی لیے وہ بہت جلد شبستان یورپ سے بیزار ہو جاتا ہے

یہ عیش فراوان یہ حکومت یہ تجارت
دل سینہ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھنوئیں سے
یہ وادی ایمن نہیں شایاں تجلی

ایک اور جگہ اسی بہشت شداد یعنی یورپ کا حال لینن کی زبان سے خدا کے حضور میں عرض کرتا ہے۔

مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے اس بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے

سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

اسی اثناء میں ۱۹۱۷ء میں روس میں سرخ انقلاب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ سرخ پرچم جو زار کی استبدادیت کا خونی کفن ہے فضاء میں لہراتا ہے۔ بندہ مزدور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ یہاں اقبال روسی، انقلابیوں کا ہمنوا بن کر دنیا کے سارے مزدوروں کو ایک پیام دیتا ہے۔

بندہ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھاگیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسترے
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھاگیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

سرخ انقلاب کی ہواؤں کی لائی ہوئی بہار انسانیت سے خوش ہوکر وہ گنگناتا ہے۔

ہوا اس طرح فاش راز فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھاکر مداری گیا

جہاں تک امتیاز رنگ و نسل، جغرافیائی تفریقات، آقائیت اور محکومی، کلیمی و فرعونی، فوقیت،

بوہیی مزدور اور سرمایہ دار کے تنازعات کا تعلق ہے۔ اقبال کا درجہ اشتراکیت سے ہمدردانہ ہے وہ معاشی مساوات کا عنصر ضرور ہے لیکن ذاتی ملکیت ۔۔۔ کا مخالف نہیں اور اسی وجہ سے اسے اشتراکی نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی معاشی مساوات کی بنیاد خالص اسلامی اخوت ہے۔ لیکن پھر بھی اس کو اعتراف ہے کہ۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار

اس لیے وہ کارل مارکس کے پیغام کو سن کر اس کے بارے میں کہتا ہے۔

نیست پیغمبر و لے دار و کتاب

لیکن اقبال ان تمام سیاسی تحریکات میں ایک نوع کی خطرناک بے راہ روی دیکھتا ہے۔ یہ تمام سیاسی پگڈنڈیاں کچھ دور تک بڑی صاف واضح اور بے خطر نظر آتی ہیں، لیکن ہر پھر کر سرمایہ دارانہ اسبتدادیت کے گہرے غار کی طرف بڑھتی ہیں، اقبال کو اس کی سب سے بڑی وجہ ایک روحانی مرکز کا اعدام نظر آتی ہے۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ بغیر اس روحانی مرکز کے انسان کی نجات ممکن ہی نہیں اور یہاں سے وہ اس آفاقی نظام حیات کا پرچار کرتا ہے جس کو اسلام بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ اپنے اس مسلک کا اعلان وہ اس شعر سے کرتا ہے۔

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس مسلک کو اختیار کرنے میں ہمیں اقبال کے بادہ فکر میں حجازی مئے چھلکتی نظر آتی ہے۔ اقبال نے اسلام کو محض ایک مذہب ہی نہیں سمجھا بلکہ دنیا کے تمام سیاسی تحریکات کا مطالعہ کر کے ان سے مایوس ہو کر اسلام کو بہ حیثیت ایک سیاسی نظام کے اہل نظر اور اہل جگر کے آگے پیش کیا وہ اسلام ہی کو بیمار انسانی مزاج اور دنیا کی آب و ہوا کے لیے سازگار بتاتا ہے۔ اب جو لوگ اسلام کو آفاقی مذہب نہیں تصور کرتے وہ اقبال کو ایک فرقہ پرست سمجھتے ہیں۔ ایک معترض نے تو اقبال کو ایک فسطائی شاعر ہی کہدیا ہے۔ اور اس کے فلسفہ شاہین کو اقتدار پرستی کا منطقی نتیجہ قرار دیا ہے وہ معترض کہتا ہے کہ اقبال جمہور پرست نہیں بلکہ فرد پرست تھا۔۔۔ اقبال شخصیت پرست ہے تحریک پرست نہیں ہے۔ اس کے کلام میں غالباً تین درجن گزری ہوئی ہستیوں کے تذکرے ملیں گے ان میں سقراط بھی ہے، ہیگل بھی، طارق بھی ہے، خالد بھی ہے، داراب بھی ہے، مولانا روم بھی، لینن بھی ہے، مسولینی بھی، ڈیوک آف ونڈسر اور نادر شاہ اور امان اللہ بھی ۔۔۔ یہ سچ ہے کہ اس کے افراد کسی نہ کسی تحریک کے نمائندے ضرور ہوتے ہیں لیکن اقبال نے کبھی ان تحریکوں پر زور نہیں دیا۔ ہمیشہ ان کی شخصیتوں کو اچھالا ہے۔

اس معترض کو بڑا غم و غصہ ہے کہ اقبال دیوانگی کی حد تک اقتدار پرست ہے، وہ ہر قوت کا استقبال کرتا ہے ہر صاحب اختیار سے متاثر ہوتا ہے قوت اور اقتدار کی مدح سرائی اس کی شاعری کا اضطراری پہلو ہے۔ اور اس میں وہ تحقیق و جستجو اور عقل و تمیز کو بھی خیرباد کہہ دیتا ہے مسولینی ۔۔۔۔۔ ڈاکو اور امن سوز انسان کش مسولینی کی شان میں قصیدہ کہتا ہے۔

ان اعتراضات کا مختصر اور جامع جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اقبال ضعیفی کو جرم سمجھتا تھا، مگر ساتھ ہی ساتھ نشہ قوت کو بھی خطرناک سمجھتا تھا۔ اقبال کا مسلک اسلام ہے۔ اس لیے اقتدار پرستی یا شخصیت پرستی کے الزامات خود بخود باطل ہو جاتے ہیں، کیونکہ اسلام نے ان دونوں بتوں کو اوندھے منہ گرا دیا ہے۔

اور پھر اقبال پر تضاد اور بے راہ روی یا خیال کے ساتھ ماخذ قائم کرنے کے الزام عجیب ہیں۔ جبکہ اقبال ایک الہامی شاعر ہے۔ خود ساختہ یا اکتسابی شاعر نہیں۔

ان تمام اعتراضات و الزامات سے قطع نظر اقبال کا عطا کردہ شاہینی تجسس، اس کا عشق براہیمی، اس کی نگاہ قلندرانہ، اس کی حرارت مجاہدانہ، اس کی طبعیت خطر پسند، اس کا نالہ، شبگیر، اس کی آہ سحر گاہی۔ اس کا فقر ملوکانہ اس کے خیال و نظر کی مجذوبی دنیا کے انسان کو زندگی کے جو صحیح اداب لکھا رہی ہے اس کے لیے انسانیت آخری غروب سورج تک اس کی ممنون رہیگی۔

آج انسانیت کا وہ محسن ہم میں نہیں ہے۔ بادشاہی مسجد لاہور کی سیڑھیوں کے پاس ایک سنگین چوبترہ نما قبر میں ابدی نیند سو رہا ہے اور اس کی قبر نئی اور خالص انسانی دنیا کی بنیاد کا پہلا پتھر ہے۔

جہاں بانو

اقبال کی ہمہ گیری

اقبال میرے لیے سب کچھ ہے ۔ ایک شاعر سب سے پہلے ۔ پھر ایک علامہ ، ایک کلیم ، ایک مصلح ، ایک مفکر ، ایک علوم رتبت فلسفی ، ایک ترجمان حقیقت ، ایک قلندر بے نیاز اور ایک عارف کامل ۔ جب کسی کے متعلق بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس "سب کچھ" میں سے پہلے کیا کہیں ۔ وہی حال میرا ہے ۔ اس لیے اس مضمون میں کوئی ربط و تسلسل تلاش نہ کیجئے ۔

مجھے تو اقبال کی بانگ درا میں ایسا لگا جیسے وہ کسی چیز کو ڈھونڈ رہا ہو ۔ بہت بیچین بیچین ۔ بلا کا مضطرب مجھے ایک تڑپ اس میں ملی ۔ ایک ... اس میں میں نے پایا ۔ ایک بے قراری سی میں نے اس میں محسوس کی ۔ جانے وہ کیا ڈھونڈ رہا تھا ... پتہ نہیں اس کی مطلوبہ چیز اس کو مل گئی یا نہ مل سکی ۔ " یہ کثرت میں وحدت " کا متلاشی شاعر ۔ وفا کو " افلاس تخیل " سے مضمون کرنے والا ہرجائی ۔ " حسن ازل " سے مضبوط پیمان وفا باندھنے کا ڈھونگ رچاتے ہوئے ایک " حسین تازہ " جس کے " ہر لحظہ مقصود " نظر بنا رہے ۔ آخر میں جو حضور رسالتمآب میں یہ کہنے پر مجبور ہو جائے ۔

حضور ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

مجھے اس کی بانگ درا میں کیا کچھ نہیں ملا ۔ اتنے اصول اس نے سکھائے لیکن وہ میری زندگی کی روایتی بے اصولی آج تک نہ گئی ۔ کبھی تو میں نے اس کے " ہمالہ " پر سر پھوڑنے کی تمنا کی ، کبھی اس کے " عقل و دل " کے مکالمہ نے مجھے سوچ بچار کی وادیوں میں کھو دیا ، کبھی اس کے زہد و رندی نے میرا ایمانی توازن بگاڑ دیا ۔ اس کی نظم " صقلیہ " نے صقلیہ کی عظمت و شوکت کو محسوس کرنے میں بڑی مدد دی ۔ اس کے ترانہ ملی نے وطنیت کے جذبہ میں طوفان مچا دیا ۔ اس کی موٹر نے خموشی اور ضبط کی تعلیم دی کیوں کہ اس نے بتا دیا تھا ۔

ہے جادہ حیات میں ہر تیز پا خموش

اس کا فلسفہ غم ۔ دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر تلاطم برپا کر گیا ۔ اس سے پہلے ہی غالب نے بتایا تھا ۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں

لیکن اقبال نے اپنی طرح سمجھانے کی کوشش کی۔ میں اس متبرک و مقدس جذبہ سے اچھی طرح روشناس ہو گئی۔ اس کی عزت میرے دل میں بہت زیادہ بڑھ گئی۔ مسرت موہوم سی ایک چیز، اور بے حقیقت و ناپائدار سی شے معلوم ہونے لگی۔ کبھی اس کے ساتھ فلک کی سیر کی۔ جب کہ وہ ستاروں سے آگے کے جہان کو پانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ کبھی اس نے "رات اور شاعر میں رات سے چپکے چپکے جو باتیں کہہ دیں ان کو سنتی اور ان کو سمجھنے کی کوشش میں اپنی گھڑیاں گنتی رہی۔ اس کے چاند نے کسی کے اس شعر کی توضیح کر دی۔

کچھ عقل کے میزان میں تولا نہ گیا
چپ ہوگیے اس طرح کہ بولا نہ گیا

ایک حاجی سے مدینہ کے راستے میں، اس کے ساتھ میری بھی ملاقات ہو گئی۔ اور مجھ پر عشق کا عقدہ کھلا۔

عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے!

گورستان شاہی کی فلسفیانہ عظمت، یہ بھولنے کی واردات نہیں۔ کبھی اس کی انکساری دیکھی۔

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
نہیں کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

اس کا "فراق" ابھی طفل شیر خوار ہی تھا۔ اقبال اس کی منزل سے ابھی دور تھا۔ اس اضطرابی جذبہ کو سمجھنے کی وہ کوشش کر رہا تھا کہنے لگا۔

یونہیں میں دل کو پیام شکیب دیتا ہوں
شب فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

پیام عشق، میں یہ نصیحت بھی تو کی ہے۔

بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہوجا

"درد دل" کے حصول کی بڑی آسان سی ترکیب اس نے مجھے بتائی اور چونکہ ع بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا۔ مجھے اس آسانی میں بھی مشکل کا سامنا ہوا۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

اور پھر اپنی اسی نظم میں اس نے مجھ سے یہ بھی تو کہا تھا۔

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

اس کے نقطہ نظر سے اس جذبہ کا حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔
"تصویر درد" بن کر اس نے جبر و اختیار کی وضاحت کر دی۔

الہیٰ پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیات جاوداں میری ، نہ مرگ ناگہاں میری

"طفل شیر خوار"، غالب کے اس شعر کی کھلی تشریح ہے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

تیرا آئینہ تھا آزاد غبار آرزو
آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرار آرزو

فی الحقیقت اقبال فلسفی بننے سے پہلے عاشق بنا۔ جبھی تو عشق اور موت، جیسی چیز اس سے لکھی گئی۔ اور ٹینیسن سے وہ متاثر ہوا۔ اس نظم میں عشق کے مقابلہ پر اس نے موت کو ایک پامال سی کیفیت بتانے کی کوشش کی ہے۔

اس کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" دل پر پتھر رکھ کر اس کو پڑھی۔ اور نہ صرف پڑھی بلکہ پڑھانے پر بھی مجبور ہو گئی۔ کیسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے جب کہ دل رونے کو چاہے اور کوئی رو نہ سکے۔

اس کے "شکوہ" نے تو مجھے پچھاڑ کر رکھ دیا۔ اتنی مسحور و مخمور ہوئی کہ جب کبھی اس کو پڑھا تخیل جھومنے لگا۔ جیسے کسی نے بہت سی تیزاب پی لی ہے۔ اس میں اقبال نے اپنے خالق سے بہت سے مخزے کئے ہیں جو سب کے سب حق بجانب ہیں۔
غالب نے کہہ دیا تھا صرف۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

لیکن اقبال نے "اسپ تازی" کو مجروح ہوتے دیکھا اور طوق زریں" کو گردن خر میں دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

یہ شکایت نہیں ، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو . فقط وعدہ ، حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں ؟

پھر خود ہی اس "شکوہ" کا جواب دے کر اپنی فن کاری کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس تباہی و ادبار کے محرک ہم ہی خود ہیں اور ہمارے اعمال۔ اور وہ عہد سلف کی یاد دلا کر ہم کو غیرت دلانا چاہتا ہے۔ دیکھا کہ اپنی زبان کا کچھ ان کندہ ناتراش انسانوں پر اثر نہ ہوا۔ تو خدا کی زبان سے کہلواتا ہے۔

کون ہے تارک آئین رسول مختار ؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار ؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار ؟
ہو گئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار ؟
قلب میں سوز نہیں ، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمد کا تمہیں پاس نہیں

اس "طرز اغیار" پر تو اس نے "بال جبریل" میں دھوم مچادی ہے۔ اور بتادیا ہے کہ ہم ویسے بھی ع جی سکتے ہیں بے روشنی دانش فرہنگ!

قصہ مختصر مجھے اقبال بانگ درا میں بڑے غیر مطمئن عالم میں ملا۔ مضطرب مضطرب سا ہو جیسے کوئی چیز ڈھونڈے کوئی اور وہ اس کو نہ ملے۔ کھویا کھویا سایہ مایہ ناز شاعر بال جبریل میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے اور کتنا مطمئن ہو جاتا ہے وہ جیسے سب ہی کچھ اس کو مل گیا ہو۔ اب جیسے وہ خود آگاہ بھی ہے اور خدا آگاہ بھی۔ ایک اطمنان سا جیسے اس کو نصیب ہو گیا ہو۔ مسلسل ٹھوکریں کھا کھا کر جیسے کوئی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ سوز و گداز سے معمور ہو کر۔ غم و الم سے چور چور ہو کر۔ لیکن اظہار پر جس کو اب بھی جیسے قدرت نہ ہو۔ اظہار بھی کرے تو جذبات کا گلا گھونٹتے ہوئے۔ زبان رکھتے ہوئے بھی گونگا ہو جیسے کوئی۔

بانگ درا میں اقبال مجھے کھلونے دے کر بہلا رہا تھا۔ ستارے، چاند ندی، پہاڑ، پھول کا تحفہ، گلہری ۔۔۔ کائنات کی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی طرف رجوع کرتا ہوا وہ اب شاہین کی معیت میں آسمانی بلندیوں پر مجھے لے جانے پر مصر ہے۔

یوں دیکھا جائے تو بال جبریل در حقیقت اس کے نظریوں کی تکمیل، اس کے معتقدات و خیالات کی معراج اور اس کے مسلک کا صحیح عکس سمجھا جاتا ہے۔ اس میں اقبال بچہ نہیں رہا۔ اس نے اب ہوش سنبھالا ہے۔ اب وہ ایک سچے انسان کی طرح اتنا صاف گو اور منہ پھٹ ہو گیا ہے کہ اس کے کڑوے بول بھی کڑوے نہیں لگتے۔ اس کے طرز کلام کی بیباکی، اس کا قلندرانہ رویہ اتنا

دل نشین ہوتا ہے کہ دل کے در و دیوار ہل جاتے ہیں اور پھر دل میں اس کی باتیں گھر بنا لیتی ہیں۔ اقبال دنوں، مہینوں، برسوں، یاد رکھنے کی ایک کیفیت کا نام ہے۔

اپنی اس انوکھی بلند پایہ تصنیف میں اقبال کی عقل دشمنی اپنے حدود کو توڑ کر پرے نکل گئی ہے۔ عقل محبوب تک رسائی کی سد راہ ہے۔ وہ ان بندشوں کو توڑ کر اب آزاد ہو گیا ہے۔ اس لیے بھی اس کے کلام میں ایک مقناطیسی جاذبیت آ گئی ہے۔ پہلے اس نے عقل کے بڑے چونچلے کئے۔ اس کے الے تلے اور ناز برداریوں میں اپنی زندگی مٹا دی۔ عقل سے کچھ نہ ملا۔ بلکہ اقبال خود ہی گم ہو گیا۔ اب اس کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے دل کو جھنجھوڑ کر اٹھایا جو اس کے پہلو میں پڑا سو رہا تھا۔ اقبال اور اس کی عقل کے معرکے اس کو خواب میں دکھائی دے رہے تھے۔ ایک دم سے عقل کو شکست سی ہوئی اور دل اس کا آنکھیں ملتے ہوئے انگڑائی لینے لگا۔ خواب ہستی کی تعبیر مل گئی اب اس دل ناداں کے توسط سے اس کو اپنے نفس کو پہچاننے میں کتنی مدد ملتی ہے۔ ذرا دیکھئے ۔۔۔۔ اس دل کے ذریعہ اس نے اپنے نفس کو پہچانا۔ ضمیر جاگ اٹھا۔ پھر اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ پھر تو اب اس کو کسی دینوی لذت کی ضرورت نہ رہی۔ وہ صحیح معنوں میں قلندر ہو گیا۔ خودی کے دروازے اس کے دل پر کھلتے گئے۔ اقبال معرفت کی راہ میں نکل گیا۔ "حدیث قدسی" کی اہمیت و عظمت اس نے مجھے سمجھائی۔ یہ بڑی بڑی باتیں۔ میرا مضمحل دماغ۔ تمس تبریزی رح فرماتے ہیں۔ "تصوف عشق و جمال کا مذہب ہے۔" اس نظریہ کو کہ عشق ہی سب کچھ ہے۔ یہی زندگی کا زبردست ہنگامہ ہے۔ قسم قسم سے شعرا نے اس پر سر دھنا ہے۔ حافظ کا یہ فیصلہ۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد ز عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اور اقبال کی یہ تشریح ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اس پر غالب کا یہ نظریہ

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

جگر نے اس جذبہ کو یوں بیان سمجھا۔

حال بھی ماورائے حال بھی ہے
عشق مشکل بھی ہے محال بھی ہے

اقبال کے نقطہ نظر سے تو خدا نہ صوفی کو ملا نہ واعظ کو ۔ کچھ تو ان کا غلط طریقہ اس کو ڈھونڈنے کا ۔ کچھ ان کی انانیت ۔ ان کا غرور ۔ ان کا گھمنڈ بیزار ہو کر کہنے لگا ۔

چشم کرم ساقیا ! دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو ، خلوتیوں کے کدو !

اقبال مشرق و مغرب دونوں سے خفا ہے ۔ وہ حرم اور کلیسا میں یکساں ریاکاری کا بازار گرم دیکھتا ہے اور پھر اپنے جنون کو ہی غنیمت سمجھتا ہے ۔ جس کی یہ دھوم ہے اس کے قلب مضطرب میں ۔

خاموش نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک ، یا دامن یزداں چاک

اقبال مغربی تہذیب کو خاطر میں نہیں لاتا ۔ اس میں غلامانہ ذہنیت کا نام نہیں ۔ اس کا تصفیہ ہے کہ مغرب نے اپنی قوتوں کو عقل کا ماتحت بنا دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرتاپا عمل بن کر رہ گئے ۔ اور مشرق نے اپنے ہر کام میں دل کی رہنمائی اختیار کی ۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ان کی عملی قوتیں کمزور ہو گئیں ۔ بلکہ سلب ہو گئیں ۔ اب یہ نوبت ہے کہ یورپ کا آدمی ایک مشین یا ایک کل ہے اور مشرق کا انسان مردہ ۔ بے حس ، بے جان ۔ اقبال اب اس دھن میں لگ گیا ہے کہ مشرق کے انسان کو عملی بنائے ۔ اس کی قوتوں کا اس کو احساس دلائے ۔ اس کے چھپے ہوئے جوہر چمک اٹھیں ۔ اس کی سوکھی رگوں میں خون دوڑے ۔ وہی خون جس کے دوران کا غالب بھی اس وقت تک قائل نہ تھا جب تک کہ وہ آنکھ سے آنسو بن کر نہ ٹپکے ۔ مشرقی دل جیسے بات بات پر دھڑکتا ہے ۔ اقبال چاہتا ہے کہ اس کے اعضائے بدن بھی اسی طرح حرکت کریں ۔ وہ اپنے لیے زندہ نہ رہے بلکہ دوسروں کے لیے جیئے ۔ زندہ رہنا کوئی کمال نہیں ۔ زندہ رکھنا کمال ہے ۔

تو دوسری طرف وہ مغرب کے آدمی کو دل اور روح کی قوتوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہے ۔ اہل مغرب کی عقل نے ان کے دل کو ان سے چھپا دیا ہے جبھی تو نہ ان کی زندگی میں کوئی لچک ہے نہ لوچ ۔ جس سے زندگی عبارت ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دماغ روشن اور ان کے دل تیرہ و تار ہو گئے ۔

اقبال اب نظر کے دھوکوں میں نہیں آتا ۔ وہ صاحب نظر بن گیا ہے ۔ یہ دنیا اپنی مسحور کن قوتوں اور ان گنت رنگینیوں کے باوجود اس کے دل سے اتر گئی ہے ۔ وہ ظاہری حسن کو ملمع سمجھتا ہے ۔ اس کی نظریں گہری اور وسیع ہو گئی ہیں ۔ وہ اپنے اس شعر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ تقلید تخلیقی قوتوں کو مردہ کر دیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ظاہری حسن پر مٹنے والوں کے لیے ایک سبق ہے ۔

کر بلبل طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے ، طاؤس فقط رنگ

سعدی رح نے اپنے شعر کی مٹی پلید ہونے پر ایک مرتبہ جھنجھلا کر کہا تھا۔

" شعر مرا بمدرسہ کہ برد ؟ "

اقبال نے اس کیفیت کو اچھی طرح سمجھا دیا۔ سعدی رح کا خیال گونگا تھا پھر بھی وہ غصہ کی بات تھی۔ ذرا سمجھ میں نہ آسکی۔ اقبال نے یوں بتا دیا کہ دیکھو سعدی رح یہ کہنا چاہتے تھے۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے ، کہہ نہ سکیں روبرو

تمنا کا اظہار تمنا کی قدر و قیمت کو گرا دیتا ہے اور شعر تشریح سے غارت ہو جاتا ہے۔

اقبال کا کلام خطروں میں زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ قوت اور عمل اس کی شاعری کے دو زبردست محرک ہیں۔ اس کی " بلبل بیزاری " کا ثبوت اس کی شاہین پسندی سے ملتا ہے۔ وہ اپنے محبوب فلسفی نیٹشے سے متاثر ہے۔ نیٹشے کی فلاسفی قوت کی پرستش سکھاتی ہے۔ اس کا شاہین خوددار اور غیرت مند ہے۔ وہ شکار مردہ بھوکا رہ کر بھی نہیں کھاتا۔ ع شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں۔ وہ شاہین و شاہباز کی مثال دے کر فقر، درویشی، خود اعتمادی اور خلوت پسندی کی ترغیب دلاتا ہے۔ اس کا شاہین کسی سے ڈرتا ورتا نہیں۔

یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

انسان بس یونہی صرف نام کا ہی اشرف المخلوقات میں سے ہے۔ اس میں ان اعلیٰ جذبات و پاکیزہ صفات کا فقدان ہے۔ اور صفات عالیہ کا حصول مشکل ترین امر ہے۔ ادنیٰ صفات بآسانی حاصل ہو جاتی ہیں۔ اقبال کے نقطہ نظر سے ماحول سے متاثر ہو کر انسان اپنی فطری صلاحیتوں اور نیچرل طاقتوں کو کھو دیتا ہے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

اقبال کی شاعری کے دو زبردست مرکز عشق اور خودی ہیں۔ بانگ درا کے اس کے " پرندہ اور جگنو " بال جبریل کے سوز و گداز سے معمور ہو کر " پروانہ اور جگنو " بن گئے ہیں۔ پروانہ کی زبان عشق سے جل گئی ہے اور یہ جل جانا ہی اس کی زندگی کی عین معراج ہے۔ اس کی زبان پر عشق بول رہا ہے۔ جگنو کے خواب میں " خودی " نکھر گئی ہے۔

پروانہ

پروانہ کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو !

جگنو

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

اقبال تصوف کا معلم ہے ۔ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے ۔ اس کے اظہار خیال میں فرشتوں کی معصومیت و الوہیت کار فرما ہے ۔ اس سالک راہ حقیقت کو ہم نے اب تک یہی سمجھا کہ وہ نرا ایک خشک فلسفی ہے ۔ عشق و محبت سے کوسوں دور ۔ وہ زندگی میں تڑپ و بے قراری کو پسند کرتا ہے ۔ عمل و حرکت اس کی شاعری کے دو نمایاں پہلو ہیں ۔ اس کا عشق تو ایک بہت ہی بلند و ارفع سی کیفیت ہے اور شعرا کے نام نہاد عشق سے بالکل جداگانہ ۔ وہ گل و بلبل کے قصوں ، سوسن و نرگس کی بیلوں سے نہیں الجھتا ۔ سرو صنوبر کا قامت پرست نہیں ۔ اس کا عشق اپنے مبدا تک پہنچانے والا عشق ہے ۔ اقبال کے یہاں عشق ایک پر عظمت کیفیت ایک بلند و ارفع جذبہ ہے ۔ اقبال وصل سے گریزاں ہے ۔ اس کو فراق سے دلبستگی ہے ۔ وہ اپنے استاد داغ کی طرح "وصل" کو ماحصل زندگی نہیں سمجھتا ۔ بلکہ جیسے ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے ۔ وہ داغ کی ضد ہے ۔ اقبال کے نزدیک فراق زندگی کی جان اور اس کی روح رواں ہے ۔ وصل عشق کی موت ۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب

اور پھر ایک مثالی سبق

گرمی ۔ آرزو فراق ، شورش ہاؤ ہو فراق
موج کی جستجو فراق ، قطروں کی آبرو فراق

وصل کا متمنی بزدل ہوتا ہے ۔ اس کا حوصلہ پست ۔ اس کی ہمت نکمی ۔ وہ جلد کسی نتیجے پر پہنچ کر مطمئن و مسرور ہو جانے کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھے ہوئے ہے ۔ اس کو در حقیقت عشق نہیں ۔ وہ تو بوالہوس ہوا ۔ ہوس تکمیل و انجام کی تمنائی ہے ۔ وہ عشق میں مر مر کر جینے کی زندگی کا لطف کیا جانے ۔ وہ اس نظریہ سے بے خبر ہے کہ "اپنے موضوع محبت کو پالینا ایک عظیم بد نصیبی ہے ۔" حسن ایک موضوع ہے محویت کا ۔ جذبات کی دنیا تصورات کی دنیا سے الگ ہے ۔ حسن ایک احساس ہے ۔ احساس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو سوچا جائے ۔ حسن ایک تصور ہے ۔

وصل اس کو بلندیوں سے قعرِ مذلت میں گرا دیتا ہے۔ اقبال تصور اور محویت میں رہنا چاہتا ہے۔ اب اس عالم میں ڈال دینے کے بعد کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ ہوں وہ ان کیفیات کو "فراق" سے معنون کرتے ہوئے ان کے سہنے کو تیار ہے۔ عشق کی منزل اتنی کٹھن ہے کہ وہ فراق کے کٹھن ترین راستہ سے ہی اس منزل پر پہنچنا چاہتا ہے بلکہ اس کو تلاش منزل میں جو مزہ مل رہا ہے وہ منزل پر پہنچنے کے بعد شاید کھو دے۔ ویسے بھی تو۔

مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبال
مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

اقبال غالباً کسی کی نگاہ کا مارا ہوا ہے۔ اس نے کلام میں جابجا اس کا اظہار کیا ہے، کبھی تو کہتا ہے۔

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

تو کبھی کہنے لگا

نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دور پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ!

کہیں یوں ماضی کی طرف لے جانے کی کوشش میں ہے

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہہ محبت! وہ نگہ کا تازیانہ

اب ہم کیسے سمجھیں کہ اقبال ایک خشک فلسفی ہے صرف؟

اقبال نئی تہذیب کی بے اصول راہروی سے بیزار ہے۔ وہ اس لیے بھی نسوانی تعلیم سے گریزاں ہے کہ اس سے نسائیت متاثر ہوتی ہے۔ نسائی حسن کی وہ صحیح معنوں میں پرستش کرتا ہے تعلیم سے فطری حیا کا فقدان اور بیباکی دیکھ کر اس کا جی جل گیا۔ اکبر نے ایسے ہی موقع پر کہا تھا۔

اے اکبر ہمارے دل کو تڑپانا نہیں آتا
کہ جس کو علم تو آتا ہے شرمانا نہیں آتا

اور جب جوش کو ایسی ہی بیباک قسم کی عورت ملی جس سے غیر نسائی حرکات کا اظہار ہونے لگا تو یہ تو پھر جوش ہی ٹھیرے۔ کہہ دیا

آہ عورت! کہاں ہے گم عورت
ہم کو لاکھوں میں ایک بھی نہ ملی

اقبال اپنی نزاکت خیال کا یوں اظہار کرتا ہے۔

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ ! نہ تراش آذرانہ

ایک اور مقام پر یہ بھی تو کہدیا ہے

یہی زمانہ حاضر کی کائنات ہے کیا ؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک

گویا اپنے ہی ایک فارسی شعر کی تشریح

چہ کنم ، چہ چارہ گیرم ز شاخ علم و دانش
نہ دمید ہیچ خارے کہ بہ دل نشانم اورا

بال جبریل میں اقبال عاشق کم اور فلسفی زیادہ ہے۔ اس کے پیرو مرید کا مکالمہ ایک ذی وقار اخلاقی چیز ہے جس میں خود مرید ہندی بن کر اپنے مرشد سے سوال کرتا ہے اور اسی کے اشعار پر تضمین باندھی ہے۔

کہیں جبریل کو ابلیس سے ہم کلام کر کے دونوں کی بات چیت کا لطف اٹھاتا ہے۔ حالی نے تو بتایا تھا

فرشتے سے بڑھ کر انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

لیکن اقبال نے ابلیس کے درجات بہت ہی بلند کر دئے ہیں۔

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو ، اللہ ہو ، اللہ ہو

محبت پر بھی ایک فلسفیانہ نظم ہے۔ ایک ایسا جذبہ جو صرف محسوس کرنے کے لیے بنا ہو۔ جس کو سمجھانے میں انسان گونگا ہو جائے۔

"ساقی نامہ" میں وہ ہنگامہ بپا کرنا چاہتا ہے کہ ہانکے پکارے۔ کہتا ہے

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر !
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر !

غرض اس کے کسی شعر میں زندگی سوتی ہوئی نہ ملے گی۔ بلکہ ہر تخیل میں زندگی کا روپ بدلا ہوا ہے۔ کہیں چمک ہے، کہیں تڑپ ہے۔ کہیں سوز و گداز کی معموری۔ کہیں کسک، کہیں ٹیس کہیں حوصلہ افزائیاں

اگرچہ غالب کی نزاکت خیال اور ان جیسی دلفریب موہنی ترکیبیں اقبال کے یہاں نہیں غالب کا جیسا ان کا محبوب نہیں۔ غالب کی ناصح بیزاری نہیں۔ غالب کا رشک نہیں۔ لیکن اقبال

کی متانت کلام، اس کا بلند تخیل، اس کے فلسفہ کی گہرائیاں، اس کے بلند و ارفع جذبات، تصوف کی چاشنی ان سب کیفیات و درجات کا لحاظ کرتے ہیں۔ اقبال کو غالب کا ایک حقیقی اور قابل عزت جانشین تصور کرنے پر مجبور ہیں۔

اقبال کی شاعری بیدار کن ہے۔ میر کی طرح لوری دینے والی، تھپک تھپک کر سلانے والی شاعری نہیں۔ میر کی طرح اقبال صرف اپنا ہی دکھ اور محض اپنا ہی احساس نہیں، بلکہ اس کو تو ساری کائنات سے دلچسپی و ہمدردی ہے۔ ایک بین الاقوامی رنگ اس کی شاعری میں دوڑتا اور کھیلتا نکھرتا اور ناچتا نظر آتا ہے۔

اقبال میری نظر میں

اقبال کا کہنا تھا کہ ایشا میں تین ذہین قومیں ہیں، کشمیری، بنگالی اور ایرانی۔ خود اقبال کے اسلاف کشمیری پنڈت تھے جو تین چار پشت پہلے مسلمان ہوگئے تھے۔ ان کا خاندان "پرو" کہلاتا تھا۔ اقبال کو اپنے برہمن زاد ہونے پر فخر تھا۔ جس کا انھوں نے جابجا اپنے فارسی کلام میں ذکر کیا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رمز آشنای روم و تبریزاست

اس سلسلے میں خلیفہ عبدالحکیم کا کہنا ہے کہ "مسلمان اور امبیڈکر برہمنوں کو کچھ بھی کہیں لیکن برہمنوں نے روحانی طریقوں اور نسلی پاکیزگی کی غیر معمولی کوششوں سے خاص تربیت حاصل کی ہے۔ جس کا نتیجا یہ ہے کہ آریائی برہمن ایک خاص قسم کا دماغ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اقبال ایک ذہین نسل سے تعلق رکھتے تھے۔"

اقبال اور سرتیج بہادر سپرو کا سلسلہ نسب ایک ہی خاندان سے ملتا ہے۔ دونوں مختلف مذہب رکھتے تھے اس پر بھی ان کے محبت آمیز تعلقات ہمارے لیے ایک سبق ہیں۔ ایک اقبال اور سپرو پر ہی موقوف نہیں اگر ہم تحقیق سے کام لیں تو ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے غیر نہیں۔ بلکہ ان کے رشتے اور ناتے کہیں نہ کہیں جاکر ضرور ملتے ہیں۔

اقبال نے ہندومت سے بھی فیض حاصل کیا۔ اور اسلام سے بھی۔ سرتیج بہادر سپرو سچ کہتے ہیں کہ "وہ لوگ اقبال کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتے ہیں جو اقبال کو محض اسلامی شاعر بتاتے ہیں کیونکہ اس سے ان کا حلقہ اثر محدود ہوجاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اقبال نے اسلامی تہذیب، فلسفہ اور عظمت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن آج تک کسی نے ملٹن اور کالیداس کو عیسائی اور ہندو شاعر کہہ کر ان کے اثر کو محدود نہیں کیا اور نہ اس کی وجہ سے ان کی قدردانی میں کمی ہوئی۔

۱۹۳۰ء میں اقبال حیدرآباد بھی آئے تھے۔ اور ان کی "مادن ہال" میں دو تقریریں بھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے قطب شاہی گنبدوں سے متاثر ہوکر "گورستان شاہی" نظم لکھی۔

ہم اکثر اپنی کم نظری کی وجہ سے کسی شخص یا چیز کے حلقہ اثر کو محدود کرکے اپنی خیر خواہی

جتاتے ہیں ۔ مثلاً اردو کو مسلمانوں کی اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان بتاکر ان کی وسعت کو گھٹاکر نادان دوست ہونے کا ثبوت دیتے ہیں ۔ حالانکہ ہندی اور اردو دونوں میں بلا تفریق ہندو اور مسلمان بلند پایہ ادیب اور شاعر ہمیں ملتے ہیں ۔ اردو کا تو کہنا ہی کیا ہے کہ اس کے جنم دینے والے ہندو اور مسلمان دونوں تھے ۔ انہیں کی گودوں میں یہ پلی اور پروان چڑھی ۔ اور آج ہمارے لیے اظہار خیال کا ذریعہ بنی ۔ ادیبوں اور شاعروں کے متعلق بھی ہم یہی نادان دوستی دکھاتے ہیں ۔ اور ان کو ہندو مسلم دایروں میں بند کرکے اپنی خیر خواہی جتاتے ہیں ۔ ایک طرف ٹیگور کو ہندو شاعر کہہ کر اپنا پریم جتاتے ہیں ۔ تو دوسری طرف اقبال کو مسلم شاعر بتاکر محبت کا ثبوت دیتے ہیں حالانکہ بلند پایہ شاعر اور ادیب اپنا پیام تمام دنیا کو پہنچاتے ہیں اور ان کا دامن فرقہ پرستی سے پاک ہوتا ہے اقبال کا پیام صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے لیے ہے ۔

اقبال ابتدا میں حب وطن سے سرشار تھے اس کے بعد ان کی نظر وطن سے بلند تر ہو گئی ۔ کیونکہ انہیں خیال ہوا کہ جغرافی حدود کی جکڑ بندی سے انسان کی نظر تنگ ہو جاتی اور اس کا دل سچی محبت سے محروم ہو جاتا ہے ۔

اقبال ہر قسم کی غلامی سے بیزار تھے ۔ چاہے وہ سیاسی رنگ میں ہو یا معاشی ، مذہبی رنگ میں ہو یا اخلاقی اقبال ہندوستان کی آزادی اور عظمت کے طالب تھے اور چاہتے تھے کہ آزادی حقیقی ہو ۔ اور اس میں سب کو مساوی حقوق ملیں ۔ اقبال اپنے وطن کی فرقہ بندیوں سے بیزار تھے ان کے دل میں وطن اور اہل وطن کا درد تھا ۔ انھوں نے انسان کو خودداری کا سبق دیا ۔ اور آزادی انسان کو اپنا مقصد بنایا اور غلامی کی برائیاں پیش کیں اور جتایا کہ آزادی ہی دنیا میں بڑی نعمت ہے اور آزاد انسان ہی اپنی قسمت آپ بنا سکتا ہے ان کے خیال میں اگر کوئی غلام ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے وہ اپنے دور کے شیخ و برہمن دونوں سے بیزار تھے ۔ انھوں نے صرف انسانی بڑائی کا گیت گایا ۔ صدیوں کے سوتوں کو جگایا اور ان میں خودداری اور جوش عمل پیدا کیا ۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مغرب میں انسانوں کی تقسیم ملک ، رنگ اور نسل کے اعتبار سے کی جارہی ہے اور ایک انسانی گروہ دوسرے گروہ کا دشمن بن گیا ہے اور ان کے دلوں سے انسانیت مٹنے لگی ہے تو اس کے خلاف آواز اٹھائی اور بتایا کہ یہ جذبانہ صرف انسانیت بلکہ اسلامی تعلیم کے بھی خلاف ہے ۔

اقبال کا پیام ساری دنیا کے لیے ہے وہ اپنے فارسی کلام کی وجہ سے سارے مشرق میں مشہور ہو گئے اور اس کے انگریزی ترجموں نے تمام یورپ میں ان کا نام روشن کر دیا ۔ اور جرمن اور برطانوی زبانوں میں بھی ان کے کلام کا ترجمہ ہوا ۔ اقبال ان شاعروں میں سے ایک ہیں جو دنیا بھر میں شہرت کے مالک تھے ۔ جہاں انھوں نے مغرب کے فلسفے سے فائدہ اٹھایا وہیں مشرق کے صوفی شاعروں سے بھی فیض حاصل کیا ۔ مگر اقبال مشرقی شاعروں کی طرح خیالی دنیا میں نہیں رہے

بلکہ وہ عملی باتیں سوچتے تھے اور انہیں اس کا احساس تھا کہ قوم کی زندگی میں شاعر کا کیا مقام ہے۔ اقبال بلند پایا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے ماہر تعلیم بھی تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں نادر شاہ، شاہ افغانستان نے انہیں بلا کر اپنے ہاں کے نظام تعلیم کو نئے سرے سے مرتب کروایا مگر اقبال کا دل محض مادی تعلیم سے مطمئن نہیں تھا۔ بلکہ وہ روحانی تعلیم کی ضرورت کو بھی محسوس کرتے تھے۔ گو اقبال آج ہم میں نہیں مگر ان کا پیام انسانیت اور آنے والی نسلوں کے لیے زندہ ہے اقبال کے پیام اور خود اقبال کی قدر و منزلت حقیقی طور پر ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ ہم اس کے پیام سے "یقین محکم" "عمل پیہم" محبت فاتح عالم، کا سبق سیکھیں۔ اگر ہمارے نوجوان اقبال کے پیام کو اپنا رہنما بنائیں تو ان کا ہر سانس "بانگ درا" بن سکتا ہے۔

افراد کو منظم کرنے والا ہر زمانے میں ایک جذبہ رہا ہے۔ کبھی یہ مذہب کے روپ میں تھا تو کبھی وطنیت اور قومیت کے رنگ میں مگر دونوں نے بھی انسانیت کو بڑا نقصان پہنچایا۔ دنیا کے مفکرین نے محسوس کیا کہ مذہبی اور قومی جذبہ انسان اور انسان میں منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی مجلس اقوام اسی کا نتیجہ تھا۔ مگر یہ بھی بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اقبال کے جذبہ انسانیت دوستی نے بین انسانیت احساس کے پیدا کرنے پر انہیں ابھارا۔ جس کا اظہار انھوں نے "مکہ و جنیوا" کی نظم میں کیا ہے۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکہ نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم ؟

اقبال بجائے قومیت کے تفرقے کے انسانی وحدت کا احساس دنیا کے سارے افراد میں پیدا کرنا چاہتے تھے اس نقطہ نظر سے اقبال کا پیام دنیا کے لیے عالم گیر امن کا پیام ہے اقبال نے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ اگر ہم ان کے کلام کو اپنے لیے رہنما بنائیں تو یقین ہے کہ ہم میں امن و حیات کی ایک تازا لہر دوڑ جائے گی۔

ایک بار اقبال نے سر اکبر حیدری کو لکھا تھا کہ "میں لاہور کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ایشیا کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر رہا ہوں"۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے کیونکہ نہ صرف ایشیا بلکہ ساری دنیا

ان کے کلام سے فائدہ اٹھارہی ہے۔ جہاں وطن پرست اس کے قومی ترانے الاپتے ہیں وہاں صوفی اس کے کلام سے وجد کرنے لگتے ہیں اور فلسفی فلسفے کا درس لیتے ہیں۔ سیاست، حکمت فلسفا، فقہ، حدیث، ملت اور وطن، ہر باب پر انھوں نے قلم اٹھایا پاکستان والے بھی ان کے کلام کی سند لیتے ہیں اور ہندوستان والے بھی، شیخ بھی ان کی سند سے گفتگو کرتا ہے اور برہمن بھی۔ ایک کہتا ہے کہ ؎

مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تو دوسرا کہتا ہے ؎

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

حقیقت یہ بھی ہے اور حقیقت وہ بھی لیکن حقیقت کے ایک پہلو سے واقف اور دوسرے سے ناآشنا لوگ آپس میں سر پھٹول کرتے ہیں۔ بہ قول کسے۔

"چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زوند"

جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ

مسلم ہیں، ہم وطن ہے سارا جہاں، ہمارا

تو ان کا ایقان یہ ہوتا ہے کہ اسلام ہی انسانیت کا علم بردار ہے اگر دنیا کے اقوام اسلام کے بتائے ہوئے اصول پر کاربند ہو جائیں تو دنیا کی ساری کش مکش چاہے وہ معاشی ہو یا سیاسی ختم ہو جائے گی۔ مگر ان کے ذہن میں وہ اسلام نہیں جو نام نہاد مولویوں کا بتایا ہوا ہے بلکہ یہ وہ اسلام ہے جو انسانی مساوات اور اخوت پر بنی ہے۔

اقبال خالق و مخلوق میں کسی توسط کے روادار نہیں فرماتے ہیں۔

کیوں خالق و مخلوق میں حایل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

اقبال نے جہاں

یونانیوں کو جس نے حیران کردیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو حق نے جس کی زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

گاکر اپنے وطن پر فخر کیا اس نے کھوی ہوی عظمت اور موجودہ پستی کا نقشہ کھینچ کر اہل ہند

کو خواب غفلت سے بیدار ہونے کا پیام بھی دیا۔ اور ہمالہ سے اس طرح مخاطب ہوئے۔

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن تیرا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اقبال فرماتے ہیں کہ جب تک انسان میں نئے نئے خیالات اور افکار کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے وہ زندہ ہے اور جب اس کی استعداد ختم ہوگی اور وہ اپنے پچھلے خیالات میں چکر کھانے لگا۔ تو سمجھو کہ وہ مر گیا

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

ہندستانیوں کے لیے ان کا پیام صاف تھا ان کا نفاق اقبال کو ایک آنکھ نہیں بھاتا

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال کے اس پیام پر پہلے سے کہیں زیادہ آج کل ہمیں توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ آج ہندوستان کی حالت ہر محب وطن کے دل سے خون کے آنسو رلا رہی ہے

اقبال کا پیام عمل ہے پیام جد و جہد ہے ان کے خیال میں حرکت زندگی اور بے حرکتی موت ہے۔ ان کے اشعار میں چلے چلو کی صدا گونجتی ہے

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو
تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاک داں سے دور نہیں

اقبال کے نزدیک عمل ہی سب کچھ ہے ان کے نزدیک انسان خدا کا نائب اور اس کے

اسرار کا حامل ہے وہ اپنے فرائض کو اسی وقت پورا کر سکتا ہے جبکے وہ نفس امارہ کا غلام بننے کی بجائے اس کو اپنا غلام بنائے۔ ظالم کے ظلم کا شکار بننے کی بجائے حق و صداقت سے آگاہ ہو کر عدل کے ساتھ ان پر عمل کرے۔

اقبال کے نزدیک محبت ہی زندگی ہے کہتے ہیں ؎

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلمان بھی کافر و زندیق
کسے گو درد پنہانی نہ وارد
تنے دارد ولے جانے نہ دارد

اقبال ریاکاری کے روادار نہیں ہیں صاف کہتے ہیں۔

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

حق پسندی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اقبال کا دل اتحاد و اتفاق پریم اور الفت کے لیے ہمیشہ تڑپتا تھا۔ نیا شوالہ میں برہمن کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں

آغریت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں نقش دوئی مٹادیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال ایک طرف دنیا کے غریبوں اور دہقانوں کو کش مکش حیات کا پیام دیتے ہیں تو دوسری طرف سرمایاداروں اور زمینداروں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے درد دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

وہ کمزوروں کو تلقین کرتے ہیں کہ دوسروں پر بھروسا کرنے کی بجائے خود اپنے اندر

قوت و صلاحیت پیدا کریں ۔ ورنہ دنیا میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جائے گی اور بڑا جانور چھوٹے جانور کو شکار کر لے گا کہتے ہیں۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتوی ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

اقبال نے حاکم اقوام کی حکمت عملی کی قلعی اس طرح کھولی ہے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلادیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ہندوستانیوں میں پیری اور مریدی کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے ۔ اقبال کے نزدیک نام نہاد پیر اور سود خوار مہاجن میں کوئی فرق نہیں ۔ دیکھیے کس خوبی سے بھانڈا پھوڑا ہے ۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبہ کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر قرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن

اقبال جہاں انسانی وحدت کے قایل ہیں وہیں کائینات کی وحدت کو بھی مانتے ہے ۔ اور انہیں کثرت میں وحدت نظر آتی ہے ۔

کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں، ہنگاموں کا محل ہو
ہر شئے میں جب کہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبال وطن کے اختلافات اور فرقہ آرائی سے سخت متنفر ہیں ۔ چاہتے ہیں کہ ملک کے ان بکھرے دانوں کو ایک لڑی میں پرو دیں ۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

نفاق انگیز فضا سے وہ اتنے گھبرا جاتے ہیں کہ بے ساختہ بول اٹھتے ہیں ۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

سر زمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
بدلے اک رنگ کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

بقول مہاراجا سرکشن پرشاد مرحوم " اقبال نے اپنی شاعری میں حکمت اور بیداری کے دریا بہادیے اور جدید نسلوں کو ان کے ذریعے جینے اور اپنے پاؤں پر آپ کھڑے رہنے کا راز سمجھایا ہے خودی اقبال کے کلام کا سرمایہ امتیاز ہے۔ اور یہی ایک لفظ اس تمام دعوت سعی و عمل کا آئینہ دار ہے۔

خودی احساس نفس بلکہ عظمت نفس کا ایک راز ہے۔ جسے اقبال کی باریک بیں نظروں نے پہچانا۔ مشرق کی موجودہ پستی نے ان کے حساس دل کو سمجھایا کہ جب تک اس کو نصب العین نہ بنایا جائے گا اقوام شرق اپنی بقائے حیات کے لیے جگہ نہ حاصل کر سکیں گی۔ اقبال جس بین قومی شہرت کے مالک ہیں وہ ان کا جایز حق ہے اقبال جیسے اعلیٰ تخیلات کے شاعر کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی مذہب اور ذات کے قیود کا تابع ہو سکتا ہے۔ اقبال کو فرزند ہند کی حیثیت سے اپنی وطنیت پر ناز ہے تو مسلم ہونے پر فخر بھی ہے اقبال کا صرف مسلم ترانہ دیکھ کر ان کو مسلمانوں کا شاعر خیال کرنے سے بڑھ کر گناہ نہیں ہو سکتا۔

اگر اقبال نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے اسلام کی خوبیوں کو واضح کر دکھایا تو ہندوؤں کی حقیقتوں کو بھی موثر پیرائے میں پیش کر کے انہیں جگایا۔ اور ہندو مسلمانوں میں قومی اتحاد کی روح پھونکی جس کی ترجمانی اقبال کے بے شمار نظمیں کرتی ہیں۔ جواہر لال نہرو کو اس کا اعتراف ہے کہ " اقبال کی شاعری کی وجہ سے موجودہ نسل بہت متاثر ہوئی۔ قوم اپنے شاعروں اور فلسفیوں سے پہچانی جاتی ہے نہ کہ سیاحوں سے۔ سر محمد اقبال کا درجہ بہ حیثیت شاعر و فلسفی دور حاضر کے سیاسوں سے کہیں اعلیٰ ہے۔ " حقیقت یہ ہے کہ صداقت اقبال کا نصب العین تھی۔ جو کچھ ان کے قلم اور زبان سے نکلتا تھا وہ ان کے دل سے نکلتا تھا۔ اس لیے وہ ہندوستان کے سچے اور بے تعصب لیڈر گنے جاتے ہیں۔

اقبال کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ سوے ہوؤں کو جگائیں بھٹکے ہوؤں کو رستے پر لگائیں۔ گرے ہوؤں کو اٹھائیں اور انسانوں کو زمانے کی تباہی سے بچائیں اقبال نے جس پر سب سے زیادہ زور دیا وہ وحدت کامل ہے اس کے ذریعے سے وہ انسانی دل و دماغ کے بت خانوں کو توڑنا چاہتے

تھے اور اسی اصول کے تحت وہ نسل انسانی کو بھی ملا جلا دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ وطن یا رنگ و نسل کی بنیاد ناپائیدار ہوتی ہے کہتے ہیں ؎

بیان میں نقطہ توحید آتو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے
برنسب نازاں شدن نادانی است
حکم اور اندر تن و تن فانی است
مدعائی ما مآل ، مایکیت
طرز و انداز خیال مایکست

اقبال نے جس چیز پر بار بار زور دیا ہے وہ خودی ہے جس کا سبق انھوں نے ؎

من عرف نفسہ فقد عرفہ ربہ
(جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو بھی جانا)

سے لیا ہے ان کے ہاں، ہماری پستی کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھول بیٹھے اور اپنی پوشیدہ قوتوں سے ناواقف ہیں۔ اقبال منکر خودی کو منکر خدا سے بڑکر کافر سمجھتے ہیں۔

منکر حق نزد ملا کافراست
منکر خود نزد من کا فتر است

مگر اقبال کی خودی کا مطلب غرور نہیں چنانچہ وہ "اسرار خودی" کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ "یہ لفظ اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے" اس کا مفہوم محض احساس نفس اور صرف ذات ہے۔ اقبال کا یہ تصور ہمیں خودشناسی کے ذریعے خداشناسی سکھاتا ہے۔ خودی اور خدا کا قریبی تعلق ہے۔ جو اسرار خودی سے واقف ہے وہ بھی خدا کو پہچان سکتا ہے انھوں نے خودی پر اتنا زور دیا کہ سیکڑوں نظمیں اس پر لکھ ڈالیں اور پوری مثنوی "اسرار خودی" کی بنیاد اسی پر رکھی اور بتایا کہ نظام عالم کی بنیاد ہی خودی پر ہے مستقبل سے مایوس دنیا کے سارے انسانوں کے لیے ان کا یہ پیام دلوں پر نقش کرنے کے قابل ہے۔

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہونا
خودی کا راز داں ہوجا خدا کا ترجماں ہوجا
ہوس نے کر دیے ہیں تکڑے تکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہوجا

اقبال ہر انسان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور غلامی کو چاہے وہ کسی شکل میں ہو انسانوں کے لیے سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں۔

نوعِ انساں کے لیے سب سے بڑی لعنت ہے یہ
شاہ راہ فطرت اللہ میں ہے غارت گری
از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن
تاتراشی خواجہ از برہمن کافرتری
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

وہ حاکموں کو آگاہ کرتے ہیں کہ ...

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے
تمیز بندہ و آقا فساد و آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اقبال نے سرمایا داری کے خلاف ہمیشہ جنگ کی ہے اور مزدوروں کی حمایت میں انقلاب کی آواز بلند کیا ہے۔ چنانچہ لینن کی زبان سے حضور باری تعالیٰ میں اس طرح پر کہلواتے ہیں۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

اس کے بعد عہدِ حاضر کی حالت کو دیکھ کر وہ یورپ والوں سے پوچھتے ہیں۔

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال ؟
مرد بے کار و زن تہی آغوش
تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اخوت
ہے حضرتِ انسان کے لیے اس کا ثمر موت

بعضوں کا خیال ہے کہ اقبال کا پیام فقط مسلمانوں تک محدود ہے اور وہ انہیں کو فرقہ بندی کی تعلیم دیتے ہیں - یہ غلطی ایسے لوگ کرتے ہیں جو ہر چیز کو سطحی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں - ایسے معترضین کا جواب اقبال کے اس خط میں درج ہے جو انھوں نے پروفیسر نکلسن کے نام لکھا ہے یہ خط "اسرار خودی" کے ترجمے کے ساتھ چھپا ہے - نیز اس کا اظہار ان بے شمار بیانوں سے بھی ہو سکتا ہے کہ جو ان کی زندگی میں اور مرنے کے بعد ٹیگور، نہرو، سروجنی نائیڈو اور سر تیج بہادر سپرو نے دیے ہیں - دور کیوں جایے خود ان کے کلام میں اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ وہ فرقہ پرستی سے بہت بلند و برتر تھے -

سر سید کی لوح تربت سے جو آواز وہ سناتے ہیں وہ آج کل ہمارے تمام رہنماؤں کی توجہ کی محتاج ہے -

دانہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں
وصل کے سامان پیدا ہوں تری تقریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تحریر سے
دیکھ اپنوں میں کہیں پیدا نہ ہو بے گانگی
چل نہ جائے ترے گلشن میں ہوا پیکار کی

اقبال کا متعصب ہونا تو کجا وہ ایسے تعصب اور فرقہ واری خیالات پیدا کرنے والوں کے خلاف رسول اللہ کی بارگاہ میں فریاد کرتے ہیں •••

لاکھ اقوام کو دنیا میں اجازا اس نے
یہ تعصب کو مگر گھر کا دیا کہتے ہیں
مرض الموت ہے جو اس کو دوا کہتے ہیں
بغض للہ کے پردے میں عداوت ذاتی
دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

اقبال نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں بھائی چارا پیدا کرنا چاہتے ہیں -

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتان رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اپنے فرزند جاوید کو جو انھوں نے نصیحت کی ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ وحدت

انسانیت کے کس قدر قایل تھے۔

حرف بد را برلب آوردن خطا است
کافر و مومن ہمہ خلق خدا است
آدمیت احترام آدمی
باخبر شواز مقام آدمی
آدمی از ربط و ضبط گیر و طریق
برطریق دوستی گامے بزن
بندہ عشق از خدا گیر و طریق
می شود برکافر و مومن شفیق

آگے چل کر فرماتے ہیں •••

افغانیم و نے ترک و تتاریم
تمیز رنگ وبو برما حرام است
چمن زادیم وازیک شاخساریم
کہ ، پروردہ یک نو بہار یم

اقبال کی ابتدائی نظموں نے یوں تو ہندوستان کی جنگ آزادی میں بہت کچھ کام کیا، مگر وہ اپنی آخری مثنوی، "اقوام مشرق" میں بھی، ہمارے باہمی اختلاف پر آنسو بہاتے، اور غلامی کی لعنت کو آزادی کی نعمت سے بدلنا چاہتے تھے اقبال نے ہندیوں کے اختلاف کے نتیجے کا اظہار اس طرح فرمایا ہے •••

ہندیاں ہایک دگر آویختند
فتنہ ہائے کہنہ را انگیختند
تافرنگی قومے از مغرب زمین
ثالث آمد درنزاع کفر و دین

جن لوگوں کو ہمیشہ اپنے جان ومال کی فکر رہتی ہے ان کے لیے اقبال کے یہ اشعار بڑے کام کے ہیں۔ مادی دولت اور محبت کی دولت کا مقابلہ دیکھیے کس خوبی سے کیا ہے •••

اپنے من میں ڈوب کر پاجا ، سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
فن کی دنیا من کی دنیا سوزومستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا سود وسودا مکروفن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

اقبال کا پیغام حقیقت میں ایک فرشتہ کا پیام ہے. جیسے جیسے دن گذرتے جائیں گے ہمیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ انھوں نے دنیا میں کیسا انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

عام طور پر لوگ زندگی کو ایک معمہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اقبال کے نزدیک زندگی ایک معمولی کھیل ہے اقبال کے خیال میں دنیا کی موجودہ ابتری کا علاج یہی ہے کہ قومیت کے تفرقے کی بجائے۔ انسانیت کے اتحاد کا احساس دنیا کی ساری قوموں میں پیدا کیا جائے اقبال اس اتحاد کو حاصل کرنے کے لیے تمام رکاوٹوں سے جنگ کرنے کی تلقین کرتے ہیں اس لحاظ سے اقبال کا پیام دنیا کے لیے ایک عالم گیر امن کا پیام ہے۔

اقبال موجودہ تعلیم سے بیزار ہیں۔ کیونکہ موجودہ تعلیم سے بے دینی پھیلتی ہے۔ اور نوجوانوں کی خودی مردہ ہو جاتی ہے۔

اقبال کے خیال میں صحیح تعلیم وہی ہے جو جذبہ جد و جہد کو بیدار کرے اور جو خودی سعی پیہم اور یقین محکم کے صفات نوجوانوں میں پیدا کرے اقبال کے خیال میں کامل انسان کے لیے اخلاقی قوت جوش فکر و عمل فرق اور خودداری ضروری ہیں۔ اقبال انسان کو عالم بنانے سے پہلے صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتے ہیں۔

موجودہ تعلیم اور تعلیم گاہوں کے متعلق ان کا خیال ہے۔۔۔

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں حکمت کے لیے ایسے مقامات

○○○○○

دوارکاداس شعلہ

علامہ اقبال

(دیدہ و شنیدہ)

علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف مجھے بس دس بارہ مرتبہ حاصل ہوا۔ پہلی دفعہ تو جب کہ وہ ابھی انار کلی میں پنجاب نیشنل بنک کی بالائی منزل میں فروکش تھے اور میں دراصل اپنے دادا استاد حضرت شیخ غلام قادر گرامی جالندھری کی خدمت میں سلام کی غرض سے پہنچا گرامی صاحب ڈاکٹر صاحب کے یہاں مہمان تھے۔ یہ ذکر غالباً ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء سے متعلق ہے۔ اور اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ گرامی جب بھی لاہور آئے میں حاضر ہوا اور کیونکہ ان کی وضعداری کے صدقے ان کا قیام ہمیشہ علامہ موصوف کے یہاں ہوتا۔ ان کے نیاز بھی حاصل ہوئے۔ گرامی کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہو گیا۔ ڈاکٹر اقبال بھی انار کلی سے میکلوڈ روڈ کی کوٹھی میں اٹھ گئے۔ میں وہاں جب بھی جاتا کسی کرم فرما کی معیت میں کہ احساس کمتری از خود پہنچنے میں مانع ہوتا۔ ہاں تو ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ مجھے بھی شاعری کا عارضہ ہے تو ایک دو مرتبہ ارشاد آمجھ سے شعر سنے۔ کسی شعر پر "ہوں" کہا ورنہ عام طور پر خاموش رہتے۔ ظاہر تھا کہ میری کاوش انہیں کسی طور قابل ستائش نظر نہ آئی ورنہ اچھے شعر پر وہ داد دینے میں بخل نہیں کرتے۔ انہیں شاید یہ معلوم تھا کہ اپنی اصل سے میں کاروباری آدمی ہوں۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا موٹر ہماری دکان کے سامنے آکر رکا۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید مجھ پر کرم فرمانے آئے ہیں ورنہ حقیقت یہ تھی کہ دکان کے صدر دروازے کے قریب ایک میوہ فروش بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کے سنگترے پسند آئے اور خریدنے کے لیے موٹر کو رکوایا۔ ان کے پاس ایک جہازی قسم کا موٹر تھا۔ ہمبر کا سب سے بڑا ماڈل۔ میں نے حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ پوچھا "تم یہاں کیسے؟" میں نے کہا "حضور! یہی ہماری دکان ہے" فرمایا "دکان کو تو میں جانتا ہوں مگر یہ معلوم نہ تھا کہ تم یہاں ہوتے ہو۔ میں خوش ہوں کہ تم کامیاب تاجر ہو۔" اور پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا "پیارے! میری مانو تو یہ شعر کہنا چھوڑ دو۔ بیکار وقت کیوں ضائع کرو۔ کاروبار کی طرف پوری توجہ دو گے تو بہتری کا امکان روشن ہے۔ شاعری آخر کس مرض کی دوا ہے؟"

میں نے یہ سنا تو پتہ چلا کہ حضرت کی رائے میرے کلام سے متعلق کیا تھی اور یہ رائے مجھ سے شعر سننے کے برسوں بعد ارزانی فرمائی ۔ وہ بھی اتفاقیہ ۔

مردم شناسی، مزاج شناسی اور ادا شناسی آپ کے ذہن رسا کے خاص جوہر تھے ۔ دوسرے کی مشکل اور نقطہ نظر کو فوراً محسوس کرتے اور تحمل اور بردباری سے برداشت کرتے ۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں ۔

ایک دن چند نیاز مند علامہ کاہالہ نور بنے قریب بیٹھے تھے ۔ ان میں ان کے بے تکلف یار نواب ذوالفقار علی خاں بھی تشریف فرما تھے ۔ شام کا وقت تھا اور گلابی جاڑے ۔ نواب نے کہا " یار ڈاکٹر! آج گھسیٹے کے کباب کھانے کو جی چاہتا ہے " آپ نے فرمایا علی بخش کو بھیج کر منگوا لیتے ہیں ۔ " نواب بولے " مگر یار! مزہ تو وہیں کھانے میں ہے " ڈاکٹر صاحب اٹھے اور کچھ ہی دیر میں تیار ہو کر آ گئے ۔ حاضر باشوں نے اجازت چاہی ۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا " سب چلو، صرف میں اور زلفی اکیلے کھائیں تو کیا لطف رہے گا؟ " حاضرین میں چونکہ میں بھی تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا " کیوں میاں گوشت کھاتے ہو؟ " اس سے قبل کہ میں اثبات میں جواب دیتا ۔ ڈاکٹر عاشق حسین بول اٹھے ۔ " حضرت انہیں انسان کا خون چوسنے سے عار نہیں بکری کا گوشت کھانے سے کیا پرہیز ہو گا ۔ " خیر ہم سب دو موٹروں میں سمٹ کر دہلی دروازے جا پہنچے ۔ گھسیٹا کبابیہ، وزیر خاں کی مسجد کے چوک میں دکان سجاتا تھا ۔ کئی تخت، چولھے، انگیٹھیاں اور تنور لگے رہتے ۔ یہاں صرف سیخ کباب تیار ہوتے ۔ وہیں قریب نانبائی کی دو کان تھی ۔ وہ نان کے علاوہ گردے کلیجی کے لیے مشہور تھا ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گھسیٹا اپنے فن کا بادشاہ تھا مگر بول چال اور برتاؤ میں کھردرا بھی تھا، اکھڑ بھی ۔ ہاں تو گاڑیاں رکیں تو ڈاکٹر صاحب اترے ۔ وہ اترے تو سب اترے، کبابوں کی دکان تک پہنچے ۔ وہاں پہلے سے گاہکوں کا ہجوم تھا ۔ لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کو پہچانا تو ادب سے ایک طرف ہو گیے ۔ یہ آگے بڑھ کر انگیٹھی سے کچھ دور گھسیٹے کی توجہ کے منتظر رہے ۔ اس نے آنکھ نہ اٹھائی تو آپ نے ذرا اعلان سے فرمایا " میاں گھسیٹے! سلام " میاں جی نے بغیر سلام کا جواب دئے فرمایا " شیخ جی! جاؤ آرام ناں موٹر وچ بیٹھو ۔ واری اوندی اے تے کباب ای بھیج دیان گا ۔ ہاں کنے تیار کراں " (شیخ صاحب! جائیے آرام سے موٹر میں بیٹھئے ۔ باری آنے پر کباب وہیں بھیج دوں گا ۔ ۔ ہاں کتنے تیار کروں)

آپ نے فرمایا چالیس کافی رہیں گے اور ڈائیور کو وہاں ٹھہرا کر خود پلٹ کر آئے ۔ کوئی نصف گھنٹے میں کباب اور نان آئے ۔ یہ واقعی لذیذ تھے ۔ ڈاکٹر صاحب اس عرصہ میں مسجد کی تاریخ اور اس کی عمارت کی خوبیاں بیان فرماتے رہے اور یہ بھی کہ گھسیٹے کے بزرگ پشت ہا پشت سے یہی کاروبار کرتے تھے اور جب مسجد بنی تو یہاں بیٹھنے لگے ۔

موجودہ دور کے ایک ریش دراز بزرگ افسانہ نگار ان دنوں کہ ابھی طالب علم تھے کہ ایک مرتبہ حالات کی نامساعدات سے تنگ آکر خود کشی کا ارادہ باندھ رہے تھے کہ حسن اتفاق سے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی انہیں پکڑ کر ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں لے گئے ۔ ماجرا سن کر علامہ نے نوجوان سے اس کا مذہب دریافت فرمایا ۔ جب پتہ چلا کہ وہ ہندو ہیں تو فرمایا "سنو میاں! ہندو ہو تو تناسخ میں بھی اعتقاد ہو گا ۔ "لڑکے نے اثبات میں جواب دیا تو کہا" حیات پس از مرگ کی تین امکانی صورتیں ہیں ۔ پہلی یہ کہ نئی زندگی موجودہ زندگی کی سی ہی ہو دوسری یہ کہ اس سے بھی ابتر ہو اور تیسری بہتر ہو ۔ ظاہر ہے موجودہ زندگی سے تم مطمئن نہیں ۔ اس سے بدتر ہو تو صورت اور بھی تکلیف دہ ہو گی ۔ ہاں اگر وہ بہتر ہو تو الگ بات ہے ۔ جب صرف ایک امکان تمہارے حق میں ہے اور دو خلاف تو پھر تم خطرہ مول کیوں لو ۔ ڈاکٹر صاحب کی دلیل موثر ثابت ہوئی اور صاحبزادے نے خود کشی کا ارادہ ترک کر دیا اور آج بحیثیت ادیب خاصے مشہور ہیں ۔

آخری زمانہ حیات میں ڈاکٹر صاحب کو ذیابیطیس کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا ۔ گلا پہلے سے بیٹھا ہوا تھا ۔ علاج کے لیے حکیم فقیر محمد چشتی کو یاد فرمایا ۔ وہ آئے تو معائنے کے بعد کہا ۔ "قبلہ! دوا دیتا ہوں ۔ انشااللہ جلد فائدہ ہونے لگے گا مگر شکر کا استعمال قطعی ترک کرنا ہو گا ۔ "ڈاکٹر صاحب نے کہا ۔ " بندہ پرور یہی تو ایک میری خامی ہے کہ شیرینی کے بغیر روٹی کا مزہ نہیں آتا ۔ خیر آپ کا حکم تو ماننا ہو گا ۔ اجازت ہو تو کھانے کے بعد منہ میٹھا کر لیا کروں ؟ " حکیم صاحب نے پوچھا آپ کس قدر میٹھا کھاتے ہیں ؟ " علی بخش جو پاس ہی کھڑا تھا بولا ، جناب یہ موتی چور کے دس لڈو ہر شام طعام کے بعد لیتے ہیں اور دو تین دوپہر کے کھانے کے ساتھ ۔ حکیم نے کہا تو خیر ایک لڈو لے لیا کرو ۔ بس ۔ اقبال نے کہا ۔ کچھ زیادہ کی اجازت دیجئے "معالج نے کہا نہیں بس صرف ایک لڈو اور نہیں حکیم صاحب تو تشخیص و تجویز کے بعد چلے گئے ۔ اب ڈاکٹر صاحب نے یہ کیا کہ حلوائی سے کہہ کر پاؤ پاؤ بھر کے لڈو بنوا لئے کہ صرف ایک پر ہی اکتفا ممکن ہو ۔ حکیم موصوف کچھ دن میں تشریف لائے تو پوچھا" کہئے دوا اور پرہیز جاری ہے ؟ "ڈاکٹر صاحب نے فرمایا" ہاں ۔ آپ کے ارشاد کے مطابق اب صرف ایک لڈو لیتا ہوں مگر تکلیف میں بظاہر افاقہ نہیں ہو رہا ۔ " کچھ دیر میں علی بخش نے بھانڈہ پھوڑ دیا تو حکیم ناراض بھی ہوئے اور جدت پر ہنسے بھی ۔

سر ذوالفقار علی کا ذکر پہلے آچکا ۔ یہ اور سر جگندر سنگھ ان کے ہم عمر بھی تھے بے تکلف دوست بھی ۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر صاحب کی اس نظم میں ملتا ہے جس کے پہلے دو شعر نواب موصوف کے موٹر کے متعلق یوں ہیں ۔

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی

موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز
مانند برق تیز ، مثال ہوا خموش

ہاں تو ایک دن نواب موصوف ڈاکٹر صاحب کے یہاں آئے تو اپنا کتا باہر موٹر ہی میں چھوڑ آئے ۔ جاوید اقبال جو ان دنوں ابھی بچے تھے دوڑے دوڑے آئے اور کہا ۔ "ابا! باہر موٹر میں ایک کتا آیا ہے" اقبال نے نواب صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" نہیں بیٹا! یہ تو آدمی ہیں

اقبال بے حد عالی ظرف تھے اور انصاف طلب معاملے میں اپنے بد ترین مخالف سے بھی ہمیشہ انصاف فرماتے ۔ اس کی خرابی ، خامی یا بد نیتی کا معاملہ اسی پر چھوڑ دیتے اور خوبی کے نہ صرف معترف ہوتے بلکہ داد بھی دیتے ۔ مثلاً مرزا یگانہ مرحوم کی رائے ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے متعلق اچھی نہ تھی اور جاننے والے جانتے ہیں کہ مرزا جو محسوس کرتے وہ کہہ بھی گزرتے ۔ مگر علامہ اپنی انصاف پسندی کے صدقے اپنے دور کے شعرا میں مرزا کو حقیقی شاعر مانتے اور ان کے با اصول ہونے کا اعتراف کھلے بندوں فرماتے ۔ فرماتے یگانہ بڑی سے بڑی بات کو شعر میں نبھانے پر قادر ہے اور شعریت کو مجروح کئے بغیر وہ زبان و بیان پر کافی عبور رکھتا ہے ۔ اس کی زندگی کا دردناک پہلو یہ ہے کہ اس کے مزاج میں لچک نہیں ورنہ وہ انسانیت کا قابل تقلید نمونہ ہوتا ۔

چونکہ لکھنو اردو زبان و ادب کا مرکز سمجھا جاتا اور شعر و شاعری کا گہوارہ ، میرے کرم فرما جناب ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے ایک واقعہ بیان فرمایا جو علامہ کے دوران قیام لکھنو میں پیش آیا ۔ وہ یہ کہ چند بندگان اخلاص کی دعوت پر وہ لکھنو تشریف لے گئے تو ایک مجلس خاص ان کے اعزاز میں منعقد کی گئی ۔ اہتمام کا مقصد یہ ہے کہ ادبا و ادب نواز شہر خاص طور پر ان کے کلام سے لطف اندوز ہوں ۔ حاضرین میں اپنے دور کے مشہور سخن فہم اور سخن گو حضرت پیارے رشید صاحب بھی تشریف فرما تھے ۔ ہاں تو فرمائش پر شیخ اقبال نے اپنی کئی نظمیں سنائیں ۔ حاضرین کچھ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اور کچھ ازرہ توقیر مہماں داد دیتے رہے ۔ اقبال نے دیکھا کہ پیارے رشید نہ صرف یہ کہ صم بکم بیٹھے رہے بلکہ ان کہ چہرے سے حیرت و بے لطفی کا اظہار بھی ہوتا رہا ۔ اقبال اس بے مزگی کو سمجھنے سے قاصر تھے ۔ خیر جب وہ پڑھ چکے تو حضرت رشید کے پاس آکر بیٹھ گئے اور نہایت ادب سے پوچھا" حضور! آپ کی موجودگی میں شعر پڑھنا ہے تو سخت بے ادبی لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا وہ غالباً آپ کی توجہ کا مستحق نہ تھا ورنہ ازرہ بندہ نوازی کچھ تو ارشاد فرماتے " پیارے رشید صاحب یہ سن کر ذرا چونکے اور کچھ توقف و تامل کے بعد جواب دیا ۔ "ہاں صاحب میں نے آپ کو سنا ۔ جو سنا اس پر غور بھی کیا مگر میں سمجھ نہ سکا کہ آپ کا کلام فارسی میں ہے اردو

میں ہے یا کسی اور زبان میں، ہم نے تو یہ زبان نہ بولی نہ سنی۔"

علامہ یہ واقعہ خوب مزے لے کر بیان فرماتے، خود ہنستے دوسروں کو ہنساتے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب علامہ کے حلقہ احباب چمن رنگ کے سرگرم رکن تھے۔ ایک واقعہ بیان فرماتے تھے۔ انہی کی زبان میں سنئے۔

"کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال بذات خود اپنی زندگی کے کسی شعبے میں عملی آدمی نہ تھے لیکن ان کی شعلہ نوائی سے بڑے بڑے قومی رہنما اپنی روحوں میں گرمی پیدا کرتے تھے اور اس روشنی میں عمل پیرا ہوتے تھے۔ ایک بار مولانا محمد علی جوہر نے آپ سے کہہ ہی دیا۔۔۔ تم نے ہمیں مومن بنادیا مگر خود ۰۰۰۰" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "سنو بھائی! تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال اطمنان سے گاتا ہے لیکن سننے والے ہو حق کرتے ہیں، وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں، بے ہوش ہوجاتے ہیں اور اگر یہی کیفیتیں قوال پر طاری ہوجائیں تو قوالی ختم ہوجائے۔ میں تو قوم کا قوال ہوں۔ میں گاتا ہوں۔ تم ناچتے ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ناچنے لگوں۔"

مولانا غلام دستگیر رشید صاحب، مرحوم کی حاضر جوابی اور زور استدلال کے ثبوت میں ایک واقعہ یوں بیان فرماتے تھے۔

"ایک دن ایک ولائیتی جہاں گرد آیا اور علامہ کی خدمت میں اپنی بیاض پیش کی جس میں ہر ملک و قوم کے بڑے بڑے لوگوں نے اپنے قلم سے کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔ اس نے درخواست کی کہ آپ بھی کچھ تحریر فرمادیں۔ علامہ نے فارسی کا ایک قطعہ لکھ دیا پھر اس سیاح نے پوچھا "آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "میرے آباو اجداد براہمن تھے انہوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گزاریں کہ خدا کیا ہے۔ میں اپنی عمر اس سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے۔"

پروفیسر خواجہ عبدالحمید ایک واقعہ سے متعلق رقم طراز ہیں:

"کیمبرج کے زمانہ میں چند ہم عصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب نے پوچھا "مسٹر اقبال! یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا میں آئے وہ سب ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ یورپ میں ایک بھی پیدا نہ ہوا؟ علامہ نے جواب دیا۔ "بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا علاقہ چن لیا۔ اللہ نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو۔ اسی لیے پیغمبر جو اللہ کی طرف سے آئے وہ ایشیا میں آئے" وہ بولے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے" انہوں نے جواب دیا "یہ تمہارے میکاولی اور مشہور اہل سیاست اس کے رسول ہیں" اس پر بہت بڑا قہقہہ پڑا۔

مندرجہ ذیل قصہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے بیان فرمایا کہ علامہ مرحوم کی احسان

شناسی اور زور استدلال کی نشاندہی کرتا ہے:

ڈاکٹر صاحب کو حکومت برطانیہ کی طرف سے "سر" کا خطاب ملا تو آپ کو اپنے مہربان استاد علامہ میر حسن سیالکوٹی کا خیال آیا جن کے قدموں میں بیٹھ کر آپ نے فارسی اور عربی کی تعلیم کی تکمیل کی تھی اور جی چاہا کہ ان کی بھی مناسب خطاب سے عزت افزائی ہو۔ آپ اس سلسلہ میں پنجاب کے گورنر کے پاس تشریف لے گئے اور استاد کے لیے سفارش کی۔ گورنر نے پوچھا "کیا ان کی تخلیقات کا کوئی مجموعہ کتابی صورت میں بھی ہے جس سے ان کی علمیت کا ثبوت بہم پہنچے۔" سر اقبال نے فرمایا "میں خود ان کی کتاب ہوں۔ ان کی قوت تخلیق کا زندہ ثبوت اور چلتا پھرتا نمونہ۔ کیا یہ کافی نہیں؟" گورنر مسکرائے اور ان کی سفارش کے مطابق حکومت ہند کو سفارش کر دی اور علامہ میر حسین کو شمس العلما کا خطاب پیش کر دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب سے متعلق ایک واقعہ ایسا ہے کہ جس پر میں جس قدر فخر کروں کم ہے اور وہ یہ کہ میں نے انہیں شعر کہتے دیکھا اور ایسے میں جو وجدانی کیفیت ان پر طاری ہوئی اور جس گداز قلب کا ظہور ہوا اس کا میں عینی شاہد ہوں۔ میں سنتا تو تھا کہ اقبال جب کبھی حضور سرور کائنات ؐ یا صحابہ کرام کا ذکر کرتے تو آنکھوں سے موتی برسنے لگتے۔ مگر میں نے ان کو اس عالم میں نہ دیکھا تھا۔ انہی کا شعر ہے۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

مگر وہ گوہر ہائے آبدار جو میری موجودگی میں آپ کی مبارک آنکھوں سے بہے، ان کو بظاہر کسی انفعال سے رشتہ تو نہ تھا مگر یہ کہ قوم کا درد اور اس کی بے حسی کا احساس رقت کا محرک ہوا ہو گا۔ براہ شعر و ادب تنہائی اور یکسوئی کے بغیر کوئی جاندار تخلیق ممکن نہیں۔ ہنسوڑ پن میں مجلسی گہما گہمی کے باوجود کوئی چلتا ہوا مصرع کہہ دینا اور بات ہے مگر سنجیدہ اور پختہ شعر کہنے کے لیے اس ماحول کی ضرورت ہے جس میں ہر ممکن اطمنان میسر ہو۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور شاید آخری بھی کہ میں نے شاعر کو کئی لوگوں کی موجودگی میں (اور لوگ بھی وہ جو صرف اسی کا منہ تک رہے تھے) شعر کہتے دیکھا اور شاعر بھی کون؟ دنیا کے چند برگزیدہ شاعروں میں سے ایک۔

ایک دن حسن اتفاق سے پنڈت ہری چند اختر اور ڈاکٹر تاثیر میری دکان پر سہ پہر کے قریب تشریف لائے۔ آتے ہی تاثیر نے کہا او لالے! جھٹ سے چائے پلا۔ ہمیں ڈاکٹر اقبال کے یہاں جانا ہے۔ میں نے پوچھا "میں بھی چلوں؟" وہ بولے، ہاں چل ان کا کاروبار تو کھلا دربار ہے۔ تجھ سے کیا فرق پڑے گا۔ ہاں اس قدر ہے کہ آداب محفل کا لحاظ رہے۔ "میں نے پوچھا" وہ کیونکر؟" فرمایا اپنی بے ہنگم فطرت سے مجبور کوئی الف لیلوی قصہ نہ شروع کر دینا۔ "ان کو شاید یہ معلوم نہ

تھا کہ میں پہلے بھی علامہ کی خدمت میں باریاب ہو چکا ہوں اور وہاں پہنچ کر میری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ خیر ہم سب ٹانگے میں علامہ کی کوٹھی جا پہنچے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے سب کو فرداً فرداً سلام و آداب کے جواب دئے اور رسمی خیریت بھی دریافت کی۔ کچھ لوگ پہلے سے رونق افروز تھے۔ ہم بھی کرسی مونڈھے کھینچ کر بیٹھ گئے۔ معمول کی باتوں کے بعد حسب معمول ڈاکٹر صاحب نے تاثیر سے کہا۔ "کوئی تازہ شعر ہوئے ہوں تو سناؤ۔ انہی دنوں ایک کامیاب مشاعرہ بزم ادب کے تحت ہوا تھا جس میں طرحی غزلیں پڑھی گئی تھیں۔ قافیہ ردیف مدعا سمجھا تھا میں، کیا سمجھا تھا میں وغیرہ۔ تاثیر نے مشاعرہ کا ذکر کیا تو نہ جانے کیا سوجھی کہ کہہ دیا کہ قبلہ! شعلہ نے بھی اس طرح میں "گر انقدر کوشش فرمائی ہے" ڈاکٹر صاحب نے میری طرف دیکھ کر فرمایا، ہاں میاں پہلے تم سناؤ، مجھے کسمساتا دیکھ کر کسی نے کہا۔ "صاحب یہ تامل کیوں؟ بہ نظر اصلاح پیش کرو۔ میں نے جرات رندانہ سے کام لے کر عرض کیا۔

ایک بت کو زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں
وائے نادانی کہ اس دنیا کو کیا سمجھا تھا میں
آپ کی بے اعتنائی کو دیا غمزہ قرار
آپ کی بے التفاتی کو ادا سمجھا تھا میں

تاثیر نے شعر پڑھے، مجھے کوئی شعر یاد نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مناسب داد سے نوازا مگر پنڈت ہری چند اختر کے اس شعر کو بے انتہا پسند فرمایا۔

تو مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں
اے خدا، میرے خدا تجھ کو خدا سمجھا تھا میں

شعر خوانی ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ علامہ پر جذب کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ حقے کی نے تو بدستور منہ میں تھی مگر کش باقی نہ رہے تھے۔ توجہ کا یہ انعطاف محسوس کیا تو ایک دانائے راز نے انگشت شہادت ہونٹوں پر رکھ کر خاموشی کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب لمحہ بھر کے لیے گویا مراقبے میں چلے گئے تھے۔ سرنگوں اور آنکھیں مندی ہوئیں۔ میں بہ ہر کیف یہ نہ سمجھا کہ یہ وجدانیت فکر سخن کے سلسلے میں ہے اور آمد ہے۔ جب آپ نے سر اٹھایا تو اختر کی طرف دیکھ کر کہا "آپ کے اشعار کی تحریک سے ایک مطلع ہو گیا۔ میں نے قافیہ بدل دیا ہے۔ حاضرین نے ارشاد، ارشاد کہا۔ ڈاکٹر صاحب نے پڑھا۔

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

اور پھر لمحہ کے توقف کے بعد نزول اشعار کہ قطعی رحمت پروردگار کا ثبوت تھا

ہونے لگا:

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہرو ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

چوتھے شعر پر آنکھیں نم آلود ہو گئیں اور پانچویں پر طفلانِ اشک حلقہ چشم سے امنڈ پڑنے کو بے قرار۔

عشق کی ایک جست نے طے کردیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
کہہ گئی راز محبت پردہ دا ریہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبط فغاں سمجھا تھا میں

اور جب اس شعر پر پہنچے۔

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں

تو آنسو عرصہ رخسار طے کر کے دامن میں گرنے لگے تھے۔ رقت کے باعث شعر صاف نہ پڑھا گیا مکرر پڑھا اور پھر شدت جذبات میں گم اسے دہرانے لگے اور اس کے بعد سنبھل گئے۔ ماحول کا اثر کہئے یا خلوص جذبہ کا جادو کہ ہم نشینوں میں سے اکثر کے آنسو تیر گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے فسون نغمہ سے اثر لے کر ہم نے بھی ان کے قافیہ اور ردیف کی پابندی سے غزلیں کہیں۔ تاثیر کا کوئی شعر یاد نہیں، اپنے لغو ہیں اور پنڈت کے واقعی سننے کے قابل۔

ذہن رہن قومیت ، احساس محبوس وطن
وائے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا تھا میں
ہاتھ شل ہوتے رہے بہر دعا اٹھتے رہے
تیری بے مہری کو اپنا امتحاں سمجھا تھا میں
سستی ایماں کا کچھ باعث ہے ورنہ ایک دن
آتش نمرود کو بھی گلستاں سمجھا تھا میں
آہ سوداگر ہی تھے وہ دوست بھی اختر جنہیں
بے نیاز کاوش سود و زیاں سمجھا تھا میں

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy, Hyderabad.

NOVEMBER 1994

★ ★ ★

ISBN - 81-86370-01-3

IQBAL ACADEMY
Madina Mansion, Narayanguda,
Hyderabad - 500 029, (A.P.) India.
Phone : 595230